50/=

رفیع الدین ہاشمی
۱۱ رنومبر ۷۵ء

غلام الثقلین نقوی

نغمہ اور آگ

ناشر:
مکتبۂ عالیہ
ایبک روڈ لاہور

برادرِ عزیزم سجاد نقوی کی خدمت
میں تحفۂ خلوص۔
غلام الثقلین نقوی
۲۳-۹-۷۲

سوار محمد حسین شہید

نشانِ حیدر

کے نام

"...... غلام الثقلین نقوی کا افسانہ "جلی مٹی کی خوشبو" جنگ کے خلاف پوری نفرت پیدا کرتا ہے، جنگ زمینوں کی اُجلی مٹی کو راکھ کر ڈالتی ہے۔ جس کی سوندھی سوندھی خوشبو میں تیزابی بُو رچ جاتی ہے تو تخلیق کا عمل رُک جاتا ہے، زمین بانجھ ہوتی ہے اور کسان کا ہل حسرت سے دَم توڑ دیتا ہے۔ لیکن دوسری سطح پر یہ انسان کے عزم و عمل کی کہانی ہے جو اپنی زمین کی جلی ہوئی جنت کی بازیافت کرتا ہے اور اس کے تخلیقی جوہر کو دوبارہ نکھار دیتا ہے۔"

____ انور سدید

چند لفظ اور

تخلیق اپنا تعارف آپ ہوتی ہے تاہم چند لفظ اور باقی تھے۔ میں نے چاہا کہ وہ بھی شاملِ کتاب ہو جائیں تو بہتر ہے۔

یہ لفظ تعداد میں زیادہ نہیں۔ اس تمہید کا آغاز اور خاتمہ صرف دو لفظوں پر ہو سکتا ہے —— وطن سے محبت اور جذبۂ سرفروشی کی تحسین —— میں نے "نغمہ اور آگ" کے افسانے انہی دو لفظوں کی تفسیر کے لئے لکھے تھے۔

کون ہے جو وطن سے محبت نہیں کرتا؟ زمین کے اس ٹکڑے پر جسے ہم وطن کا نام دیتے ہیں، کسی کی کٹیا ہے اور کسی کا محل۔ ظاہر ہے کہ اپنے آشیانے سے تو پرندے بھی محبت کرتے ہیں پھر اس میں انسان کی کیا تخصیص ہے؟ جی کچھ بھی نہیں! یہ بھی سچ ہے کہ کوئی جاندار اپنے گھر کے بغیر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتا اسی طرح کوئی قوم بھی وطن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اس مجموعے کے افسانوں میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے یہی جذبہ کارفرما ہے۔

وطن کی زندگی کا دارومدار جذبۂ سرفروشی پر ہے۔ پاک فوج اس کی بہترین مظہر

ہے۔ وطن کے سپاہی نے وطن کی تاریخ کے صفحوں پر اپنے لہو سے نئے نئے عنوان لکھے۔ میں نے ان میں سے کچھ داستانوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اس مجموعے کی اشاعت کا سب سے بڑا جواز بھی یہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ افسانے قومی ادب کا جزوِ جانفزا بن کر زندہ رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو تاہم میں نے اپنا فرض بجالانے کی ایک حقیر سی سعی تو کی ہے۔ میں اسے اپنا سرمایۂ حیات سمجھتا ہوں۔

اِس مجموعے میں شامل افسانوں کا تعلق ستمبر ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ سے ہے۔ ان کی مجموعی اشاعت میں چھ سال کی تاخیر ہو گئی ہے۔ ان چھ سالوں میں کئی انقلاب آئے۔ نومبر ۱۷ء میں ایک اور جنگ ہوئی۔ یہ جنگ بھی ہم پر حسبِ سابق مسلّط کی گئی۔ میں نہیں جانتا کہ ہم اس جنگ میں شکست سے کیوں دوچار ہوئے۔ یہ ایک اسرار ہے۔ اس پر سے پردہ اٹھا تو نجانے حقیقت کے کس بھیانک رُخ کا سامنا ہو۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس جنگ میں بھی ہمارے سپاہی کی شجاعت نے وہی کارنامے دکھائے جن کا مظاہرہ ۶۵ء میں ہوا تھا۔ اس کے جذبۂ سرفروشی میں کوئی زوال نہ آیا۔ افسوس صرف یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد ہم کوئی افسانہ تخلیق نہ کر سکے۔ یہ افسانے مشرقی پاکستان کے چپّے چپّے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ قیصرِ ہند میموریل اور کیمپ جوڑیاں کی تسخیر میں لہو کی سرخی ملی ہوئی ہے جو افسانے کا عنوان بن سکتی ہے لیکن ہم اندھیروں میں بھٹک گئے ہیں اور اندھیروں کی کوکھ سے شفق کی لالی بھی پھوٹتی ہے۔ ابھی ہم اس سُرخ حاشیے کو نہیں دیکھ سکتے، جو تاریکیوں کے دامن کو تابناک بناتا ہے۔ انشاء اللہ ہم بہت جلد تاریک گپھاؤں سے نکل کر روشنیوں کے شہر میں آئیں گے تب ہم نہایت اُجلے افسانے لکھیں گے۔ مایوسی اور دل شکستگی کے افسانے نہیں، امید اور

دل شکستگی کے افسانے، روشنی اور اجالے کے افسانے ۔ اب ایک نیا پاکستان وجود میں آنے والا ہے ۔ شکست و فتح عارضی چیزیں ہیں لیکن قومیں زندہ رہتی ہیں اور جو قومیں بحران میں سے گذر کر زندہ رہیں اپنی تعمیرِ نو کے بعد زیادہ پائدار اور مضبوط ہوتی ہیں ۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی ہزیمت کے بعد ابھی تک ہم دل شکستہ ہیں ۔ اس فضا میں اگر گذشتہ عظمت کی کوئی جھلک نظر آجائے تو وہ غنیمت ہے ۔ اس لحاظ سے بھی ان افسانوں کی اشاعت ضروری ہے ۔ عارضی شکست سے گذشتہ قومی کارنامے مٹ نہیں جایا کرتے بلکہ ان کی تب و تاب میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اندھیرا گہرا ہو تو روشنی اور روشنی کی خواہش شدید تر ہو جاتی ہے ۔

اب چند لفظ ان افسانوں کے متعلق :

اس مجموعے کا ہر افسانہ ایک عام سپاہی کا افسانہ ہے ۔ میری رسائی صرف انہی تک تھی ۔ میں انہیں جانتا اور پہچانتا ہوں ۔ تاریخ صرف جرنیلوں کے کارناموں کو یاد رکھتی ہے، وہ سپاہی کو بھول جاتی ہے ۔ افسانے میں سپاہی کی اہمیت زیادہ ہے ۔ افسانہ اسی کے کارنامے سے وجود میں آتا ہے ۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ میں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں لکھا تھا ۔ اس افسانے کا ہیرو دیہات کا رہنے والا ہے ۔ مجھے دیہات سے محبت ہے ۔ میں نے اس افسانے میں اسی ماحول کی ترجمانی کی ہے ۔ اسی طرح "نغمہ اور آگ" کا شاعر مزاج اور حق پرست سپاہی بھی دیہات سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کی شاعرانہ حق پرستی آگ سے گذرتی ہے تو کندن ہو جاتی ہے اور تب افسانے کے روپ میں ڈھل جاتی ہے ۔ میں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے

"سبز لوپش" پر مجھے بہت ناز ہے۔ یہ میرے اس روزانہ سفر کی یادگار ہے جو جنگ ستمبر کے دوران مجھے شاہدرہ گاؤں سے سنٹرل ٹریننگ کالج تک کرنا پڑتا تھا۔ مجھے ہر روز دو مرتبہ راوی کے پل پر سے گذرنا پڑتا تھا۔ میں نے پل پر ٹریفک کا ہجوم دیکھا۔ اتنا ہجوم کہ گھنٹوں تک پل کو پار کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں کئی بار سائرن کی للکار پر سائیکل پھینک کر سڑک کے کنارے کسی گڑھے میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا۔ میں نے پل پر گنی اینٹی ایر کرافٹ توپوں کی گھن گرج بھی سنی اور یہیں "سبز لوپش" کا بیج میری کشتِ دل میں پڑا۔ بعدازاں جب جنگ کی تفصیل معلوم ہوئی تو یہ بیج پھوٹا اور "تناور درخت بن گیا اس افسانے میں "پل" اور "سبز لوپش" علامت کے طور پر آئے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان اپنا سبز لوپش آپ ہوتا ہے۔ معجزے اس کے اپنے وجود اور ایمان سے جنم لیتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اب بھی جب مایوسی کے بادل چھائیں گے تو ہم اپنے اندر کے "سبز لوپش" کو ضرور دریافت کر لیں گے۔

میرا خیال تھا کہ "جلی مٹی کی خوشبو" ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا آخری افسانہ ہو گا لیکن اس مجموعے کا خاتم افسانہ "ایک سپاہی کی ڈائری" ہے اور یہ غیر مطبوعہ ہے۔

"جلی مٹی کی خوشبو" اب بھی ہمیں پکار رہی ہے۔ صرف کسان کو نہیں ہر پاکستانی کو۔ اسی مٹی سے نیا پاکستان جنم لے گا۔ ہمیں اس پکار پر لبیک کہنی چاہئے۔ اس خوشبو میں تعمیرِ وطن کا فلسفہ پنہاں ہے۔ اس فلسفے سے آگے مانگے تانگے کے فلسفے ہیں اور یہ سراب ہیں کیونکہ جو فلسفہ زندگی اپنے خمیر سے نہ اٹھے وہ بہت جلد سڑے ہوئے پانی کی طرح متعفن ہو جاتا ہے۔

۱۴ راگست ۱۹۷۲ء

غلام الثقلین نقوی

نقوش

کافوری
شمع

کافوری شمع

دُور توپیں دھاڑ رہی تھیں!

دھوں، دھم، دھم، دھوں کڑکتی ہوئی بجلیوں کی گرج مسلسل ہو کر رہ گئی تھی!

"ناسی! توپیں یہ چل رہی ہیں ابھی تک؟" صغراں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ کل سے کچھ مسلسل توپیں چل رہی تھیں۔ اسے دیر سے نیند آئی۔ محاذ ان کے گاؤں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ جنگ کی لپیٹ میں آنے والے لوگ پرسوں سے ان کے گاؤں میں آ رہے تھے۔ کچھ ابھی تک ان کے گاؤں کے مہمان تھے۔ کچھ آگے اپنے اپنے رشتہ داروں کے ہاں پناہ لینے کے لئے نکل گئے تھے۔ دشمن نے سرحد پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ ٹڈی دل فوج لے کر آیا تھا اور ہمارے مٹھی بھر جوانوں نے ان کا حملہ پسپا کر دیا، لیکن محاذِ جنگ سے شہری آبادی کو اٹھانا پڑا۔

"یہ تو ہماری توپیں ہیں صغراں، جو دشمن پر آگ اگل رہی ہیں۔ وضو کر کے نماز پڑھ لو۔"

صغراں آنگن میں کھڑی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا، ماسی تو نہ جانے کب اٹھیں، کب انھوں نے دودھ بلویا۔ اب وہ مصلّے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچّے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ انہیں توپوں کی گھن گرج نے لوریاں دے دے کر سلایا تھا۔ کتنی گہری نیند ہے ان بچّوں کی!

صغراں نے وضو کیا اور مصلّے پر کھڑی ہو گئی ماسی ایک طرف کو سرک گئیں۔ صغراں نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو نیلے آسمان پر ہلکی ہلکی سُرخی چھا گئی تھی۔ اس نے آٹا گوندھ کر چولہے کا رُخ کیا۔ آگ روشن کرنے کے لئے اس نے سوکھی لکڑی کو تیلی دکھائی اور دھویں کا ایک مرغولہ اٹھ کر آسمان کی طرف پرواز کر گیا۔

"ماسی" صغراں نے پکارا "قرآن شریف لے آؤں؟"

چند لمحوں بعد ماسی نے جواب دیا "کیا کہا بیٹی؟"

"ماسی! تو سو گئی تھی۔ کل سے مجھے سانجھ سویرے جگا دیا کرنا، میں دودھ بلوؤں گی، تو بہت تھک جاتی ہو گی!"

"نہیں تو بیٹی .... آج نہ جانے کیا ہوا۔ میں مصلّے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی۔ میں سو بھی نہیں رہی تھی، پر میری آنکھیں کھلی تھیں اور ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا۔ ایک نالے کے کنارے مٹھی بھر سپاہی بندوقیں لئے سینہ تانے کھڑے ہیں اور دوسرے کنارے پرے کے پرے تھے اور ان کی بندوقوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور اس کنارے والے لوگ گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑے

مُسکرا رہے تھے اور میں ڈر گئی بیٹی! میرے دل سے ایک آواز اٹھی، یہ مٹھی بھر لوگ کون ہیں جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرا رہے ہیں۔ یہ اس ٹڈی دَل کا کہاں تک مقابلہ کر سکیں گے بھلا؟ ..... کہاں تک .....؟ میرا تن بدن لرز گیا اور دھوئیں کا بادل ساری دنیا پر چھا گیا اور دوسرے کنارے کے لوگ آگے بڑھنے لگے تو میں بے اختیار چیخ اٹھی: مولا تو ہی اِن کا رکھوالا ہے یہ مجاہد شہادت کا پیالہ پی گئے تو ہماری کون حفاظت کرے گا؟ اور میری چیخ میرے ایک بیٹے نے سن لی"۔

"کس نے؟" صغراں چونک اٹھی

"صغراں! دھوئیں کا بادل چھٹ گیا اور چاندنی پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ماں! کوئی فکر نہ کر۔ یہ لوگ ہماری لاشوں پر سے گزر کر تجھ تک پہنچیں گے اور بیٹی! نہ جانے اس آواز میں کتنا اثر تھا کہ فوراً میرا خوف جاتا رہا۔ میں نے یوں جانا جیسے اس کی آواز میں توپ کی گرج ہو، جیسے وہ دشمن کو للکار کر کہہ رہا ہو۔ اس کنارے پر موت کھڑی ہے ایک قدم آگے نہ بڑھنا اور میری بیٹی! میری آنکھیں کھل گئیں"۔

"ماسی! وہ کون تھا جس نے تیری پکار کا جواب دیا"۔

"وہ اس کنارے کھڑا تھا۔ اس کے گرد نور کا ہالہ تھا۔ میں اسے پہچان نہ سکی"۔

"یہ آواز تو میرے انگ انگ میں خوشبو کی طرح لبی ہوئی ہے۔ میں اسے کیسے نہ پہچانتی بیٹی!"

"ماسی! یہ کس کی آواز تھی؟" صغراں نے لرزتی ہوئی آواز میں پھر پوچھا

"بیٹی! یہ آواز شیر بہادر کی تھی۔ اپنے شیر بہادر کی..... پر بیٹی اس آواز میں سارے پاکستان کی للکار تھی۔ وہ سبھی میرے بیٹے ہیں نا جو اس طرف کنارے پر سینہ تانے کھڑے تھے...... وہ سبھی میرے بیٹے ہیں نا.. مجھے طاقچے میں سے قرآن شریف تو لا دو بیٹی "!

صغراں طاقچے کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند تھی۔ سارے کمرے میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اسے دھند میں راستہ نہیں مل رہا تھا۔ پھر توپ گرجی اور کمرے میں روشنی کی کرن لرز گئی۔ دھند چھٹ گئی سامنے قرآن شریف کا طاقچہ تھا....

اُس نے قرآن شریف ماسی کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود آنگن میں آ گئی چولہے کی لکڑیاں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ اس نے رنگین پیڑھی پر بیٹھ کر چولہے پر توا رکھ دیا اور آٹے کا پیڑا بنایا اور ماسی قرآنِ شریف پڑھنے لگیں۔ ان کی بوڑھی آواز میں ملکوتی لے تھی...... دِل کا دکھ..... سوز اور جلن..... دُکھ جس میں دنیا بھر کی ممتا سمٹ آئی تھی...... یہ دکھ بھری مقدس لے...... اور چولہے کے سامنے بیٹھے بیٹھے وہ اس کی لے کے شہ پر اڑی اور دھیرے دھیرے ایک آنگن میں اُتر گئی کھلا آنگن جس میں بکائن کا درخت تھا اور اس کی شاخوں پر چڑیاں چُوں چُوں کر رہی تھیں اور آنگن میں دُھوپ اور سائے لرز رہے تھے۔ سایوں کی لرزش میں آسمان کی نیلاہٹ گھل مِل گئی تھی۔ اور وہ آنگن میں اکیلی تھی۔ اس کا باپ، اس کے بھائی کھیتوں پر کام کاج کر رہے تھے اور اُس کی ماں ہمسایوں کے ہاں چلی گئی تھی۔ اور وہ اکیلی تھی..... پر وہ اکیلی بھی تو نہیں تھی۔ اس کے جوان سپنے اس کے ساتھ تھے اور بکائن

پر چڑیاں پھُر پھُر اڑ رہی تھیں اور گا رہی تھیں۔

"تم اکیلی ہو صغراں"؟

"نہیں تو۔۔۔۔۔"

"ماسی کہاں گئی؟"

"ہمسایوں کے ہاں"!

"گھر میں کوئی بھی نہیں اور پھر بھی تم اکیلی نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ واہ صغراں"! ایک قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔ وہ چونک گئی۔۔۔۔۔ اس نے۔۔۔ دوپٹے کی اوٹ میں سے کہا "نہیں تو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔"

"تم مجھے پہچان نہ سکیں صغراں؟ تم کونسے سپنوں میں کھوئی ہوئی تھیں"؟

صغراں دوپٹے کی اوٹ میں سے مسکرائی۔۔۔۔۔"میں تمہیں نہ پہچان سکی! تمہیں نہ پہچانوں تو اپنے آپ کو کیسے پہچانوں! تم تو میرا سپنا ہو۔ بڑا سہانا سپنا ہو۔ بڑا سہانا سپنا۔ میں گھر میں اکیلی کہاں تھی؟ تم میرے ساتھ تھے۔ اب تو تم ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہو۔۔۔۔" لیکن وہ منہ سے نہ بولی۔

"میری طرف دیکھو صغراں"

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ میں آنکھیں بند کر لیں پر اس نے اسے جی بھر کر دیکھا وہ کتنا سجیلا گھبرو تھا۔ تیکھی تیکھی مونچھیں۔ لمبا قد، گھٹا ہوا جسم۔ چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر چیرا، کھلے گریبان کا کرتہ، کھڑکھڑاتا ہوا تہبند، ہاتھ میں لاٹھی، جس پر پیتل کی شامیں چمک رہی تھیں اور وہ تو ازل سے اُسے اسی لباس میں دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ بچپن سے جوانی تک کوئی بھی منزل ایسی نہ آئی تھی جب اس نے اسے اس لباس

میں نے دیکھا ہو۔

"میری طرف دیکھو صغراں"!

"میں تمہیں تو دیکھ رہی ہوں"

"پر تمہاری آنکھیں تو بند ہیں۔"

"نہیں تو۔۔۔۔۔" اور اس نے آنکھیں کھول دیں اور حیران ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔۔۔۔۔۔

"یہ کون تھا۔۔۔۔۔؟"

یہ سجیلا جوان جس کے سر پہ چیرا نہیں تھا۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی نہیں تھی۔ یہ سبز ٹوپی اوڑھے ہوئے جوان جس کی کلف سے اکڑی ہوئی خاکی وردی میں اس کا قد اور بھی نکل آیا تھا۔ اس کی تیکھی مونچھوں پہ ایک عجیب سا وقار تھا اور اس کی مسکراہٹ میں کتنی سنجیدگی تھی۔ اس کا سارا سراپا بدل گیا تھا۔

"یہ تم ہو۔۔۔۔۔ یہ تم ہو بہادر!"

"ہاں صغراں! یہ میں ہوں بہادر، پر اب میں سپاہی شیر بہادر ہوں۔"

صغراں بے اختیار ہنس پڑی۔ "سپاہی شیر بہادر، ڈھول سپاہی۔ میرا ڈھول سپاہی۔"

رنگین پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"میریا ڈھول سپاہیا! تینوں رب دیاں رکھاں" اور وطن کی محافظ توپ نے دھم دھم گرج کر کہا:

"تینوں رب دیاں رکھاں"

اور حوالدار شیر بہادر۔ اس چھوٹے گاؤں کی عزت کا محافظ..... اب اس گاؤں سے چند کوس دور۔ اپنے سینے کو آہنی دیوار بنائے کھڑا تھا۔ اس دیوار سے پرے دشمن کے سینکڑوں ٹینک تھے، ہزاروں بکتر بند گاڑیاں، توپیں، مشین گنیں اور برین گنیں تھیں۔ اور ادھر...... ادھر اس کا گاؤں تھا۔ ہرا بھرا گاؤں جس کے کھیتوں میں دھان کی فصل لہرا رہی تھی، مکّی، باجرے اور نیشکر کے کھیت صبح کی نرم نرم دھوپ میں نہا رہے تھے۔ ٹیوب ویل پھک پھک چل رہا تھا اور نالے میں صاف شفاف چمکتا ہوا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح بہہ رہا تھا اور دُھلے دُھلے نیلے آسمان پر بادل کا ایک دھبّا بھی نہیں تھا۔ اس آہنی سینے کی اوٹ میں ایک نہیں لاکھوں گاؤں تھے۔ نہروں سے سیراب ہونے والے گاؤں۔ ہر گاؤں اس کا اپنا گاؤں تھا۔ اس کا وطن جس کی مٹی سے اسے پیار تھا۔ یہ پُرسکون گاؤں جس کے کچّے پکّے مکانوں میں دھواں اُمڈ رہا تھا اور نیلے آسمان کو چھو رہا تھا، چولہوں کا دھواں..... اور یہیں اس گھر کی چار دیواری میں صغراں تھی...... ایک صغراں نہیں لاکھوں کروڑوں جو اُس کے دست و بازو کا سہارا لئے اطمینان سے چولہوں کی آگ روشن کئے بیٹھی تھیں۔

"حوالدار شیر بہادر؟" صوبیدار صاحب بولے

"یس سر"۔ وہ اٹنشن ہوگیا۔

"تم رات بھر سے جاگ رہے ہو؟"

"یس سر"

"تم تھک گئے ہو"

"نہیں جناب۔"

"مجھے اپنے جوانوں پر بڑا فخر ہے۔ تم نے اپنے سینوں پر دشمن کا حملہ روک دیا ہے۔"

"سب اللہ کا فضل ہے صاحب!" شیر بہادر نے یقین محکم کے ساتھ جواب دیا "جوان! ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ دشمن پھر سخت حملہ کر رہا ہے۔ اس کے سینکڑوں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں حرکت میں آ رہی ہیں۔"

"صاحب!" شیر بہادر نے سینہ تان کر کہا۔ "ادھر ہر جوان کا سینہ آہنی دیوار ہے۔ یہ ٹینک میرے سینے پر سے گزر کر ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

"شاباش جوان!" صوبیدار صاحب بولے "ہماری کمپنی کے کارنامے پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جائیں گے۔ یہ کمپنی....... جیالے جوانوں کی کمپنی ہے..... گزشتہ دو دن سے ان مورچوں پر جم کر بیٹھی تھی۔ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی، گولے پھٹے، مشین گنیں چلیں لیکن اس کا قدم ایک انچ پیچھے نہ ہٹا۔ ... دشمن کے اچانک حملے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلے اس کمپنی کو حرکت کرنے کا حکم ملا۔ اس نے مورچے سنبھالے ہی تھے کہ ان پر فائر شروع ہو گیا۔ اور آج دشمن بہت بڑا حملہ کرنے والا تھا... بہت بڑا..... شیر بہادر مسکرا اٹھا..... پھر ایک توپ گرجی ایک گولہ سنناتا ہوا اس کے سر سے گزر گیا اور فضا کا سینہ چیر کر دور کہیں جا کر دھم سے پھٹ گیا۔

"حملہ شروع ہو گیا ہے۔" شیر بہادر نے سوچا اور جواب میں وطن کی محافظ توپ نے شیر کی طرح گرج کر کہا۔ "شیر بہادر فکر

نہ کرو اب سے تم میری حفاظت میں ہو"۔

"نہیں میں اس کی حفاظت میں ہوں، جو ارض وسما کا مالک ہے۔ میں نے اپنی جان اسی کے ہاتھ بیچ دی ہے اور اسی کے فرمان سے میں لسے اپنے مذہب اور اپنے وطن کی عزت پر نچھاور کر کے سرخرو ہو جاؤں گا۔ انشاءاللہ"

"مورچوں میں چلے جاؤ"۔ صوبیدار صاحب نے حکم دیا۔

اور سب جوان مورچوں میں بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ رائفلوں کے ٹریگروں پر تھے ان کی عقابی آنکھیں بہت دور دشمن پر جمی ہوئی تھیں۔

اُدھر وہ گاؤں جو شیر بہادر کے آہنی سینے کی اوٹ میں تھا، صبح کی نرم نرم زرد زرد دھوپ میں بڑے سکون سے نہا رہا تھا۔ چوہدری اللہ داد کا ٹیوب ویل چھک چھک چل رہا تھا اور چاندی کی چھوٹی سی نہر کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی ان کی سرسبزیوں میں گھل مل گئی تھی نیشکر کے گھنے کھیت دھوپ میں نکھر گئے تھے اور ہوا کے سرد و گرم جھونکے ان کی پھننگوں سے کھیل رہے تھے اور چند کوس کے فاصلے پر توپیں گرج رہی تھیں۔

دُور سے توپوں کی گھن گرج خوفناک لگتی تھی۔ اس لئے چوہدری کے چہرے پر پر ڈر اور خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیں تھی۔ وہ صبح منہ اندھیرے ٹیوب ویل پر چلا گیا تھا اور اب صبح کا ناشتہ کرنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اور وہ رستہ چلتے سوچ رہا تھا

"نہ جانے شیر بہادر کس محاذ پر ہے!"

شیر بہادر جو اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ بڑا کھلنڈرا، بڑا نٹ کھٹ،

چلبلا اور شریر تھا ۔ اسے پڑھنے لکھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا پھر بھی اُس نے دسویں پاس کر لی تھی وہ بچپن ہی سے نڈر تھا اور کمزور کے لئے طاقتور سے اُلجھ جانے میں اسے ذرا باک نہیں تھا ۔ سچ پر اڑجانے والا، حق گو اور حق پرست جس کے منہ سے کبھی کوئی جھوٹ نہ نکلا تھا ۔ اس نے دسویں پاس کی تو چوہدری اللہ داد بڑا خوش تھا کہ اب اسے پٹوار مِل جائے گی، لیکن شیر بہادر نے کبھی پٹوار کی خواہش نہ کی اس نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ لیا اور چوہدری اللہ داد کے دن پھر گئے ۔ وہ پڑھا لکھا تھا ۔ اس نے زرعی بنک سے قرض لیا اور ٹیوب ویل لگایا ۔ ٹیوب ویل کا پاک دپاکیزہ پانی خون پسینہ کی کھاد کے ساتھ ملا تو دھرتی سونا اگلنے لگی ۔

اور شیر بہادر سے چھوٹے بھائی نے آٹھویں پاس کر کے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تو شیر بہادر نے ہل کی ہتھی اس کے ہاتھ میں تھما دی اور خود ایک دن سیالکوٹ چلا گیا اور جب وہ شام کو لوٹا تو اس کے چہرے پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی ۔

چوہدری اللہ داد نے پوچھا " بہادرے کہاں رہے سارا دن "

" میں شہر چلا گیا تھا "

" کیا کرتے رہے ہو وہاں تم "

" بابا میں بھرتی ہو گیا "

" پولیس میں ! " چوہدری نے اشتیاق سے پوچھا ۔

" نہیں بابا .... فوج میں "

" فوج میں " ! چوہدری نے چونک کر کہا اور پھر وہ خاموش ہو گیا ۔

اور جب شیر بہادر ٹریننگ کے بعد فوجی وردی میں ملبوس ، چاق و چوبند چھٹی

پر آگیا تو چوہدری کو بے اختیار خوشی ہوئی اور اس کا سینہ فخر سے تن گیا۔ اس چھٹی میں اس کی شادی کر دی گئی اور سال گزرتے رہے۔ شیر بہادر لانس نائک بنا۔ پھر نائک ہوا اور اب وہ حوالدار تھا۔ اور اس اثنا میں صغراں کی گود دو بار ہری ہوئی اور دونوں بار خدا نے اُسے اولاد نرینہ سے نوازا۔

اور چند کوس کے فاصلے پر گرج رہی تھیں۔

سرحدی دیہات کے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ کوئی یہاں کوئی وہاں پناہ لے رہا تھا لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے "آؤ آؤ! یہ گھر تمہارے ہیں" چوہدری اللہ داد کے گاؤں کے لوگ صبح و شام دیگیں اتار تے اور مہمانوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

"اس وقت یہاں شیر بہادر ہوتا تو کتنے جوش و خروش سے اس کار خیر میں حصہ لیتا"

چوہدری نے سوچا۔ نہ جانے شیر بہادر کہاں ہے!

نہ جانے کہاں؟

سرحد سے آنے والے لوگ کہہ رہے تھے کہ دشمن نے اچانک حملہ کیا۔ پاکستان کے مٹھی بھر مجاہدوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ ان جیالے سپاہیوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی اور دشمن کا حملہ اپنے سینوں پر روکا۔ دشمن لیپا ہو گیا یہ سینے خارا شگاف چٹان تھے کہ طوفان کا منہ مڑ گیا اور اب گزشتہ دو دن سے سرحد پر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی اور توپیں بھوکے شیروں کی طرح دھاڑ رہی تھیں۔

"نہ جانے میرا شیر کہاں ہے؟ ..... شیر بہادر جو خطرے کی بو سونگھ کر

بے خطر آگ میں کود جایا کرتا تھا"!

" نہ جانے کہاں ؟ مجھے کچھ معلوم نہیں "چوہدری نے سوچا.

اور توپوں نے گرج کر جواب دیا۔" تم نہیں جانتے ؟ شبیر بہادر ہی تو خارا شگاف چٹان ہے جس نے طوفان کا منہ موڑ دیا ہے۔"

"چوہدری! آج چونڈے کی طرف بہت زور ہے" ایک دیہاتی نے کہا۔

" اللہ مالک ہے" چوہدری نے کہا " خدا پاکستان کو فتح دے گا"

"آمین"! چوہدری بولا

اور شبیر بہادر کی ماں مصلے پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں "شبیر بہادر نے کتنی مومن ماں کا دودھ پیا ہے" چوہدری نے سوچا۔ "نماز روزے کی پابند سخی ماں، جس نے جوانی میں بھی نماز قضا نہ کی اور غریبی میں بھی کوئی سوالی اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ دودھ کا کتنا اثر ہوتا ہے!..... اور میں.... میں تو یونہی سا مسلمان ہوں۔ کبھی جی چاہا تو دو سجدے دے لئے۔ کوئی مصیبت پڑی تو گڑ گڑا کر دعا مانگ لی۔ پر اللہ رحیم و کریم ہے، اس نے میرے گھر میں کتنی برکت نازل کی۔ یہ سب اس مسلمان عورت کا دم قدم ہے" چوہدری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جن میں ندامت اور تشکر کی آمیزش تھی۔

"بیٹی صغراں ابھی روٹی نہیں پکی ؟" چوہدری نے پوچھا

"جی!" وہ چونک گئی "روٹی ! روٹی پک چکی ہے" اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

"تم کچھ سوچ رہی ہو بیٹی !"

"جی نہیں ....." صغراں نے کہا اور آخری روٹی توے پر ڈال دی۔
چولہے سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور آنگن میں نرم نرم دھوپ چمک رہی تھی۔
کتنا پرسکون سماں تھا اور اس دھوپ سے پرے توپیں گرج رہی تھیں۔ اور شیر بہادر کی ماں مصلّے پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت میں کھوئی ہوئی تھی اور اس کی لے میں دل کا خلوص تھا کہ توپوں کی آواز بھی اس لے میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔ چوہدری کانپ کر رہ گیا۔ ایک عجیب سی کپکپی، ایک سرسراہٹ۔ جیسے اس نے آج پہلی بار قرآن سنا ہو۔ وہ قرآن جس کا ایک لفظ بھی اگر کسی پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ خوف سے لرز کر راکھ بن جاتا۔
اور یہ آسمانی نغمہ تھرتھراتی آواز کے پردوں پر سوار ہو کر دور محاذ کے ایک مورچے پر بکھر گیا۔
"میری ماں اس وقت قرآن پڑھ رہی ہے اکبر۔" شیر بہادر نے اپنے مورچے کے ساتھی نائیک اکبر سے کہا۔
"حوالدار صاحب! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اکبر نے پوچھا۔
"ہوا کے ایک تھرتھراتے ہوئے جھونکے سے ...... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قرآن کا ایک ایک لفظ اوس کے چھینٹوں کی طرح میرے دل پر ٹپک رہا ہو اکبر۔"
"اللہ اکبر۔" اکبر نے جذبات سے بوجھل لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
ابھی شیر بہادر اس فردوسی کیف میں کھویا ہوا تھا کہ صوبیدار صاحب کی بارعب آواز گونجی اور سب جوان مورچوں سے نکل آئیں۔ کمپنی کمانڈر صاحب ان سے

بات کریں گے۔"

اور چند لمحوں بعد کمپنی کمانڈر میجر صاحب ان کے سامنے کھڑے تھے۔ میجر صاحب جو ہمیشہ اگلی صفوں میں رہتے ایک سپاہی کی طرح، میجر صاحب جنہیں کمپنی کے ایک ایک جوان سے پیار تھا اور کمپنی کا ایک ایک جوان پیار کرتا تھا۔

" مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔ دشمن ایک بکتر بند ڈویژن کی مدد سے ہم پر حملہ کر رہا ہے۔ ہم سب سے اگلے مورچے پر ہیں۔ ہمارے ٹینک اور ہماری ٹینک شکن توپیں پچھلے مورچوں پر ہیں، میں نے وائرلیس کر دیا ہے۔ انہیں اتنی جلد یہاں نہیں بھیجا جا سکے گا۔ ہم تعداد میں بہت کم ہیں۔ لیکن ایمان میں ہم بہت طاقتور ہیں ہم مسلمان ہیں اور مسلمان دشمن کی کثرت سے نہیں ڈرتا۔ جوانو! اگر دشمن کے ٹینک ان مورچوں پر سے صحیح سلامت گزر گئے تو ہم اپنی قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جاؤ کہ دشمن کے ٹینک اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔"

"انشاء اللہ" سب جوانوں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور ان کے سینے تن کر آہنی دیوار بن گئے۔

" جوان اپنے اپنے مورچوں میں چلے جائیں۔"

معاً درختوں کی اوٹ سے، نیشکر کے کھیتوں سے، مٹی کے تودوں کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور شیر بہادر کی کمپنی نے رائفلوں کے ٹریگر دبائے اور مشین گنوں کا منہ کھول دیا۔ برین گنیں چیخیں اور گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ درختوں کے پتے گرنے لگے۔ اور نیشکر کی پھننگیں اڑنے لگیں۔

جیسے اولے گر رہے ہوں اور اولوں کی اس بارش میں دشمن کی پیدل فوج کے پرخچے اڑ گئے، جیسے وہ چبایا ہوا بھوسہ ہو۔ اولوں کی تاب نہ لا کر دشمن کی پیدل فوج پسپا ہو گئی۔ اور اب اس کے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں حرکت میں آ گئے۔ ان کی توپیں شعلے اگلنے لگیں اور دھویں کے بادل بلند ہونے لگے۔

ایک....... نہیں .... دو .... نہیں...... بیسوں ٹینک جو مست ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑ رہے تھے اور ان کے مقابلے میں ایک بھی ٹینک شکن توپ نہیں تھی، رائفلیں، مشین گنیں اور برین گنیں تھیں اور جوانوں کا آہنی عزم جو اُن کی پیشانی پر تقدیر کا نوشتہ بن کر ثبت ہو گیا تھا۔

وہ قوم جو ایمان کی قوت سے بہرہ ور ہو باطل کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بن جاتی ہے۔

درختوں کی ٹہنیاں اڑ رہی تھیں۔ زمین سے گرد و غبار کے بادل اٹھ رہے تھے۔ دھان کے سرسبز کھیت ٹینکوں تلے کچلے جا رہے تھے۔ مکئی باجرے اور نیشکر کے لہلہاتے کھیت آتش فشاں کی آگ میں جھلس رہے تھے اور ٹینک بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ایک....... نہیں .... دو .... نہیں ....

بیسوں ٹینک درختوں کی اوٹ سے، گرے ہوتے مکانوں کے پیچھے سے، کھیتوں میں سے چلے آ رہے تھے اور یہ ٹینک آگ اگل رہے تھے۔

"جوانو! سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو جاؤ کہ دشمن کے ٹینک اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔"

سیسہ پلائی دیوار!——

حوالدار شیر بہادر نے رائفل پھینک کر کہا " جوانو! میرا ساتھ کون دے گا کہ ہم ٹینکوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو سکیں "۔

اور اس کی للکار پر پلاٹون کے تمام جوان سینہ تان کر مورچوں سے نکل آئے اپنی جیبوں کو گرنیڈوں سے بھر لو۔ ایک ایک جیب کو۔ اپنے ہاتھ میں گرنیڈ لے لو۔ اور ہر نوجوان گرنیڈ پھینکتا ہوا آگے بڑھے اور ..... "

حوالدار شیر بہادر نے رک کر ایک ایک چہرے کا جائزہ لیا۔ اس نے بات پوری نہ کی لیکن یہ ادھوری بات اس کی آنکھوں میں بجلی کا کوندا بن کر لپک گئی تھی اور ہر جوان کے چہرے کو روشن کر گئی تھی ۔

اور ٹینک مست ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑ رہے تھے اور حوالدار شیر بہادر کے جوان گرنیڈ لے کر ان کے سواگت کے لئے بڑھ رہے تھے۔

آگ برسانے ہوئے ٹینک اس طوفان سے بے خبر تھے جو ابھی خاموش تھا۔

جوانوں نے درختوں کی آڑ لی۔ کھیتوں کی مینڈھوں کے پیچھے چھپ گئے مشین گنوں کی گولیاں ان کے اوپر سے گزرتی رہیں۔

اور یکا یک گرنیڈ پھٹے اور ایک بڑھتا ہوا ٹینک رک گیا۔ اس سے دھویں کے بادل اٹھے اور آگ کے شعلے نکلے۔ لیکن ٹینکوں کی یلغار جاری رہی اور زمین اس کے بوجھ تلے کانپتی رہی اور اچانک ایک ٹینک سیسہ پلائی دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور بھک سے اڑ گیا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اور ان دھماکوں سے زمین اٹھ کر آسمان سے جا ٹکرائی اور آسمان زمین پر گر پڑا۔ کئی آتش فشاں

پہاڑ یکے بعد دیگرے پھٹے۔

مگر حوالدار شیر بہادر کے مورچے سے ایک ٹینک بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک بھی نہیں ..... اور پھر دھویں کا بادل گہرا ہو کر ساری کائنات پر محیط ہو گیا۔ اور شیر بہادر کے گاؤں میں دھوپ اور بھی نکھر گئی اور قرآن کے اوراق سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور اس کا گھر خوشبو سے لبالب بھر گیا۔

شیر بہادر کی ماں نے پوچھا "صغراں بی بی! یہ خوشبو کہاں سے آئی؟"

"ماسی! میں تو اس خوشبو میں نہا گئی ہوں۔ کہیں ہمسایوں کے گھر میں اگربتی نہ جلی ہو؟"

"نہیں تو صغراں! یہ خوشبو تو قرآن کے اوراق سے نکلی اور گھر بھر میں پھیل گئی اور یہ خوشبو تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہے اگربتی کی خوشبو تو گرم گرم ہوتی ہے نا بیٹی؟"

"ہاں ماسی ..... جیسے مشک کافور۔"

"پگلی کہیں کی؟" ماسی کے چہرے پر ہلکی سی زردی چھا گئی "مشک کافور ..... نہیں تو بیٹی ..... مگر تم سچ کہتی ہو۔ یہ تو کافور کی خوشبو ہے۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ ایک کافوری دھند، اور کافوری دھند میں ایک ہیولے کی تشکیل ہوئی اور ہیولے کے نقوش واضح ہوئے تو ایک چہرے نے مسکرا کر کہا "ماں! میں شیر بہادر ہوں۔ میں نے تیرے دودھ کی لاج رکھ لی نا؟"

"ہاں بیٹے تو سرخرو ہوا، اور میری محنت بھی رنگ لائی۔"

اور شیر بہادر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مسکراہٹ کوثر و تسنیم میں ڈھل گئی اور ایک

چھینٹا ممتا کی آنکھ کا ازلی اور ابدی آنسو بن گیا...... ایک آنسو..... اور دھند چھٹ گئی۔ اور خوشبو گھر کے در و دیوار کو معطر کر کے سمٹ گئی اور قرآن کے اوراق میں سما گئی۔ اور معاً ایک کافوری شمع روشن ہوگئی۔ اس کی ٹھنڈی روشنی میں قرآن کی ایک سطر شہاب ثاقب کی طرح چمکی۔

"شہید مرتے نہیں۔ انہیں مردہ مت کہو!"

ماسی نے دھیمے سے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون" اور وہ سجدے میں گر گئیں۔ دیر بعد انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا تو صغراں نے پوچھا۔

"ماسی! کیا بات تھی؟"

"میں نے شکر کا سجدہ ادا کیا صغراں"!

"کس بات کے لئے؟"

"خدا نے ممتا کو آنچ دے کر میرے ایمان کو کندن بنا دیا ہے۔ بیٹی! سچ جانو! مجھے ایمان کی دولت آج نصیب ہوئی"!

(۲۷ ستمبر ۱۹۶۵ء)
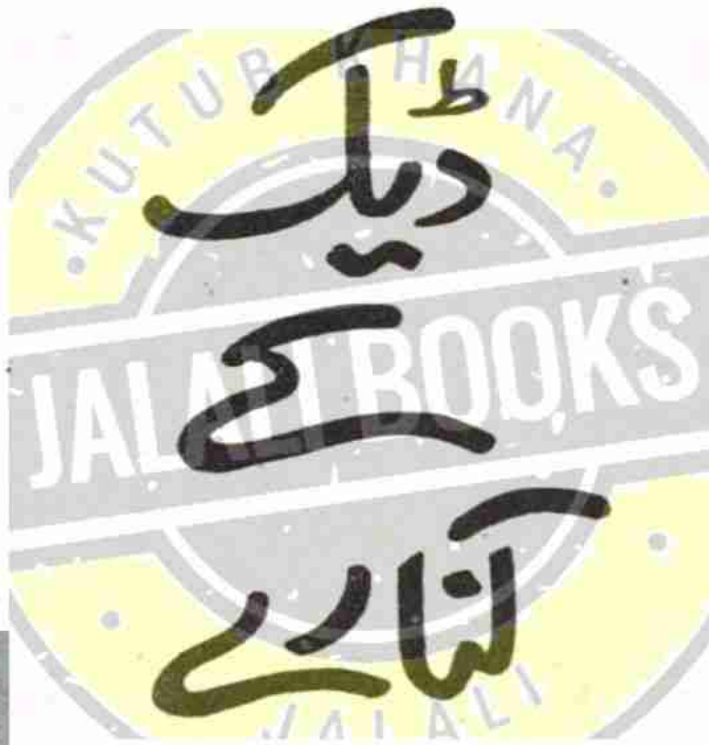
ابھی مسجد میں صبح کی اذان بھی نہ گونجی تھی کہ انہیں گاؤں خالی کرنا پڑا!
مسجد کے سفید مینار چاند کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اور گاؤں کے کچے مکانوں کی دیواریں اداس چاندنی میں سوگوار سی نظر آرہی تھیں۔

ڈیک کے اس کنارے کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے اور ڈیک کے پرلے کنارے سے تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اور ڈیک کے اس کنارے پنشنی جمعدار افضل خاں گاؤں کے رائفل بردار جوانوں کو لے کر درختوں کی اوٹ میں مورچہ لگا چکا تھا اور ان میں رحم علی بھی شامل تھا۔ اس سرحدی گاؤں کو رائفلیں ملی ہوئی تھیں اور جمعدار افضل خاں نے انہیں تربیت دی تھیں۔ کیونکہ جمعدار کو باڈر سکیم کے تحت اس گاؤں میں زمین ملی ہوئی تھی۔ اور اس کے دستے میں ارد گرد بہت سے جوان شامل تھے یہ کوئی اتنا بڑا قافلہ نہ تھا۔

ضلع سیالکوٹ کے ایک نالے کا نام

اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ڈیک پار سے آئے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ کچھ بھی نہ لا سکے تھے۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھاگ نکلے تھے۔

علی محمد نمبردار ان کی کہانی نہ سن سکا تھا کیونکہ اس نے اردگرد کے دیہات کو خبردار کرنا تھا اور قافلے کی سرکردگی بھی اسی نے کرنی تھی اور وہ .... وہ سایہ بھی لرز اٹھا تھا........ وہ سایہ جو روشنی کے سیلاب سے بھاگ کر دل کے ایک دور دراز کونے میں پناہ لے چکا تھا۔ "ابھی نہیں۔ یہ کہانی بہت دکھ بھری ہو گی۔ اسمیں نہ جانے کتنے بچوں کی چیخیں ہوں۔ کتنی ہیروں کی سسکیاں ہوں، جنہیں اپنی جوانی کا زہر بھرا پیالہ پینا پڑا ہو........ نہیں........ ابھی نہیں......" سائے نے لرز کر سرگوشی کی۔ اور پھر قافلہ چل پڑا۔

ڈیک کی طرف سے ہوا کا جھونکا آیا۔

"علی محمد! گرائیاں!" ہوا کے دوش پر ایک ہی رعب دار آواز ابھری۔

"قافلے کو بچا کر لے جاؤ علی محمد اور دیکھو"...... آواز میں سرگوشی تھی دھیمی سی لجاجت،

"سیماں کا خیال رکھنا۔ میرا فکر نہ کرنا، سنگیا! سیماں تیری بیٹی ہے یں اگر"...علی محمد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر احتجاج کیا "افضل خاں"

"سنو تو سہی" جمعدار نے کہا تھا "موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں انگریز کے لئے موت سے کھیلتا رہا۔ اب تو میں وطن اور قوم کی حفاظت کے لئے رائفل ہاتھ میں لے رہا ہوں۔ میں تو اب موت کو گلے لگاؤں گا سنگیا! یہ تو شہادت کی موت ہو گی..... پر سیماں میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اس پر کوئی آنچ آئی تو تم اس

"..... تو تم اس کا گلا خود ......"

"نہیں!" علی محمد نے چیخ کر کہا۔

اور قافلہ چل رہا تھا۔ قافلے کے درمیان عورتیں تھیں اور مردوں نے انہیں نرغے میں لے لیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں اور ٹکوے تھے اور چھویوں کے پھل پھیکی پھیکی چاندنی میں چمک رہے تھے۔

علی محمد نے کہا۔ "بیٹی سیماں! قافلے کے درمیان رہو۔ ادھر ادھر نہ ہونا۔"

"نہیں چچا! میرا فکر نہ کرو۔" سیماں کی نازک سی آواز میں جمعدار افضل خاں کی آواز کی گھن گرج تھی۔ ایک اعتماد، ایک یقین۔ علی محمد مطمئن ہو گیا! لیکن دل کی دور کی گپھا میں ایک سائے نے لرز کر اس کے اطمینان کو گہنا دیا صرف ایک لمحے کے لئے ....

یہ اس کی دوسری ہجرت تھی۔

قافلہ چل رہا تھا اور ان کے ہاتھ ہتھیاروں سے خالی نہیں تھے اور قافلے کی پشت پہ رائفلیں تنی ہوئی تھیں اور دارالامان بہت قریب تھا۔

اور آج سے ۱۸ سال پہلے .....

اٹھارہ سال پہلے ایک قافلہ رواں دواں ہوا تھا۔

اور اس قافلے میں جوان عورتیں تھیں، بوڑھی عورتیں تھیں، بچے، بوڑھے بیمار تھے اور صحت مند نوجوانوں کے ہاتھ ہتھیاروں سے خالی تھے۔ کیونکہ ان سے ہتھیار چھین لئے گئے تھے اور اس قافلے کی منزل بہت دور تھی۔ ایک موہوم

منزل۔ افق سے اس پار اور افق ہر بڑھتے ہوئے قدم سے دور ہٹ رہی تھی اور اس افق پر کئی بار اندھیرے چھائے۔ کئی بار اجالے ہوئے اور کئی بار اجالوں کا دامن خون سے رنگ کر سرخ ہو گیا اور افق ہر قدم پر دور سے دور ہٹتی رہی۔

اور اس وقت علی محمد جوان تھا۔

اپنے گاؤں کا جیالا گبھرو جس نے زندگی سے ہمیشہ روشنیوں اور مسکراہٹوں کا خراج لیا تھا۔

وہ جو چھوی چلانے میں ماہر تھا جس کی بہادری کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پنجاب کا دیہاتی نوجوان جس نے میلوں ٹھیلوں میں خون گرم رکھنے کے بہانے دوسرے جوانوں کو للکارا تھا اور اس کی چھوی کے چمکتے ہوئے پھل کا ایک لشکارا جوانوں کی پسپائی کا مظاہرہ کر چکا تھا!

اور یہ مضبوط ہاتھ اپنے گاؤں کی حفاظت کرتے رہے تھے جس پر بلوائیوں نے کئی بار حملہ کیا تھا اور علی محمد کی چھوی نے ان کی تلواریں توڑ دیں۔

اور پھر انہیں حکام کے کہنے پر گاؤں خالی کرنا پڑا۔

کیمپ کے گرد ہندو فوج کا پہرہ تھا اور ہندو فوج نے ان کے ہتھیار چھین لئے تھے اور پھر بلوائیوں کی تلواریں بے دریغ ان کے سروں پر چمکیں اور وہ مولی گاجر کی طرح کٹ گئے اور ان کی جوان عورتیں چھین لی گئیں اور نہتے کاروان کو مویشیوں کی طرح ہانک دیا گیا اور ان کے بچوں کو قتل کر دیا گیا۔

اور نہ جانے علی محمد کیسے زندہ رہا اور اس کی بیوی بھاگاں کیسے محفوظ رہی حالانکہ نہتے علی محمد کے بازو شل ہو چکے تھے اور بھاگاں ابھی جوان تھی۔ وہ اپنے بوڑھے

باپ کو نہ بچا سکا تھا اور اس کی ماں کی لاش بے گور دکفن پڑی رہی کیونکہ اس پر موت کی غشی طاری ہو چکی تھی۔

اور پاکستان ابھی کالے کوسوں دور تھا۔ افق سے اس پار۔۔۔ یا شاید منزل قریب آگئی تھی!

اور ابھی افق کی پیشانی پر خون شہیداں کی سرخی اچھی طرح سے رنگ نہ لائی تھی کہ ان کے لٹے پٹے، کٹے پھٹے کارواں پر حملہ ہوا۔ اور علی محمد جو مقابلے میں کبھی نہ بھاگا تھا۔ جیسے موت کی للکار زندگی کا لقمہ بن کر اپنی طرف بلا لیا کرتی تھی، موت سے بھاگ کر کماد کے ایک کھیت میں چھپ گیا۔

خون شہیداں خوب رنگ لایا۔

شفق ایک نئی نویلی دلہن کی طرح نکھر گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک زرد زرد پھیکا پھیکا چاند مسکرا اٹھا۔ اور وہ مری ہوئی مسکراہٹ کے انبار تلے نہ جانے کسے تلاش کر رہا تھا۔ علی محمد کو جس کی مردانگی کی لاش کماد کے کھیت میں سڑ رہی تھی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ وہ تو موت کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ جو موت کے ڈر سے بھاگ گیا تھا۔۔۔۔ اور موت اس سے بھاگ رہی تھی کیونکہ وہ موت کو گلے سے نہ لگا سکا تھا۔

اور میدان میں چاند کی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"تم!" ایک زخمی آواز پکاری۔

"ہاں میں۔۔۔۔ نہیں بھاگاں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میری لاش تو کماد کے کھیت میں بے گور دکفن پڑی ہے۔"

"کرم علی مر چکا ہے۔"

"کون کرم علی؟"

"میری آنکھوں کے سامنے اسے چھوی لگی۔ وہ سسک سسک کر مر گیا۔ میں اسے بچا نہ سکی۔ میرے پاس تو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں تھا۔"

"بھاگاں چھوڑ دو اس قصے کو......"

"میں نے چھوی کے وار کو ہاتھ پر روکا۔ پر چھوی رحم علی کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور وہ میری گود سے گر گیا۔"

"کہاں؟" علی محمد نے مری مری آواز میں پوچھا۔

"میں اس کے کھوج میں پھر رہی ہوں۔ اب تو مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا۔"

بھاگاں لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی!

اور پھر چاند ڈوب گیا۔

اور موت نے شہر پر پھیلائے۔ اور دور دور تک اندھیروں کا سیلاب اُمڈ آیا اور علی محمد اندھی گپھا کے سایوں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا اور اسے رستہ نہیں مل رہا تھا۔

صبح کی روشنی میں بھی رات کا اندھیرا تھا۔ وہ اندھیرے میں کرم علی کو تلاش کر رہا تھا۔ رحم علی کو ڈھونڈھ رہا تھا اور قافلہ تھک ہار کر سو چکا تھا اور ہندو فوجی انہیں جگا رہے تھے۔ "اٹھو! اب چلو اپنے پاکستان کو چلو۔"

اور تھکا ہارا قافلہ حرکت میں آ گیا!

یہ قافلہ جو اپنی لاشوں کو دفن نہ کر سکا تھا کیونکہ لاشوں کے شہر میں کوئی

بھی تو زندہ نہیں تھا۔

کرم علی کی لاش ایک گڑھے میں پڑی ہی۔ علی محمد نے اسے سپردِ خاک نہ کیا کیونکہ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی دھوپ نے رحم کھا کر اسے کفن اوڑھا دیا تھا۔ اور تھوڑی دور سڑک کے کنارے رحم علی پڑا تھا۔ اس کا خون اس کے سر پر جم چکا تھا۔ اور اس کا چہرہ خون اور کیچڑ میں لت پت تھا۔ بھاگاں نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ اس نے دامن سے ایک دھجی پھاڑ کر اس کا منہ پونچھا۔ ناک اور منہ میں سے کیچڑ نکالا اور علی محمد نے رحم علی کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض دھیمے دھیمے چل رہی تھی۔

"بھاگاں! رحم علی تو زندہ ہے۔"

اس نے کُرتے کا بٹن کھولا اور رحم علی کے منہ میں دودھ ڈال دیا اور رحم علی نے دودھ پر منہ بھی نہ ڈالا۔

بھاگاں سڑک کے کنارے بیٹھ گئی۔ "رحم علی! میرے لال! دیکھو تو سہی۔ مجھے پہچانو۔۔ میں تمہاری ماں ہوں! رحم علی"

رحم علی کی خون میں تھڑی پلکوں میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی جیسے اس نے ممتا کی آواز سن لی ہو۔

بھاگاں نے اپنے تار تار دوپٹے کی ایک دھجی سے رحم علی کے زخم کو باندھ دیا اور قافلہ اس کے پاس سے گزرتا رہا۔

"اٹھو"۔ ایک سپاہی نے اسے ٹھوکر لگا کر کہا۔ "اپنے پاکستان نہیں نہیں جاؤ گی"

"اُٹھو بھاگاں!" علی محمد نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

بھاگاں نے رحم علی کو علی محمد کی گود میں دے دیا اور پھر وہ اس کے کندھے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لڑکھڑا کر چلنے لگی اور ابھی افق بہت دور تھی اور افق کے اس پار پاکستان تھا اور گھنے درختوں کی اوٹ میں افق کی منزل ہر قدم سے دور ہوتی چلی جارہی تھی اور علی محمد کے پاؤں تھک چکے تھے اور اس کے بازو شل ہو چکے تھے اور اس کے بازوئں پر رحم علی ایک چٹان بن کر آگرا تھا اور بھاگاں کا ہاتھ اس کے کندھے پہ انگارے کی طرح جل رہا تھا۔

اس نے بھاگاں کا ہاتھ جھٹک کر کہا: "اپنے سہارے چلو بھاگاں!"

اور بھاگاں لڑکھڑا کر رہ گئی!

چند قدم اور چل کر وہ رک گیا۔ اس نے رحم علی کی نبض پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھاگاں! میں اس لاش کو کہاں تک اٹھائے پھروں گا!"

بھاگاں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں لاش کو کیوں اٹھائے اٹھائے پھروں؟" علی محمد بڑبڑایا۔

اس نے رحم علی کی لاش سڑک کے کنارے ایک گڑھے میں رکھ دی جس کی تہہ پہ ہلکی ہلکی نمی تھی۔

بھاگاں نے رحم علی کی لاش پر ایک نظر ڈالی اور اس کی ویران ویران آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔

اور پھر علی محمد اور بھاگاں زمین پر بیٹھے تھے اور لوگ پانی کے کوزے بھر بھر کر انہیں پیش کر رہے تھے۔ یہ سرزمین پاکستان کی تھی۔ پر اس کی افق پر اتنی سرخی کیوں تھی!

اور پاکستان کا ایک سپاہی ایک زخمی بچے کو گود میں اٹھائے کیوں پھر رہا تھا۔ یہ بچہ جس کے سر پر سفید پٹی بندھی تھی۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

"نجانے کس کا؟ مجھے کیا معلوم؟ یہ سپاہی مجھ سے کیوں پوچھ رہا ہے؟"

اور بھاگاں نے لپک کر بچے کو کیوں اٹھا لیا ہے؟

"بہن! جب ہم نے تمہارے قافلے کا چارج لیا تو ہم نے قافلے کے کئی مردوں کو دفن کیا۔ بیماروں کو بھی اپنی گاڑیوں پر لادا اور ہمیں یہ بچہ گڑھے میں سے مل گیا۔ یہ زندہ تھا۔ نجانے یہ کیسے بچ گیا۔ معجزہ ہے! معجزہ!"

بھاگاں کی آنکھ کے خشک سوتے کیوں پھوٹ بہے ہیں؟

"رحم علی! تم زندہ ہو میرے لال!" بھاگاں کی آواز میں ممتا کی پکار تھی۔ ممتا جو مر نہ سکی تھی۔ حالانکہ وہ مر گیا تھا اور رحم علی زندہ تھا اور اب وہ پاکستان کی سرزمین پر تھا۔ وہ زمین جس تک پہنچنے کے لئے قدم قدم پر اس کا خون بہا تھا اور موت کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے تھے۔ موت اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھی۔ موت جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکا تھا۔ کیونکہ زندگی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا اور اس کے دل کی روشنی بجھ گئی تھی۔ موت کا ایک سانس زندگی کے دیئے کو بجھا کر گھپ اندھیرا کر گیا تھا!

اور پاکستان آگیا تھا۔

اور ابھی رات کا اندھیرا تھا اور روشنی زندہ نہ ہوئی تھی حالانکہ پاکستان کا سورج کئی بار نکلا تھا اور ڈوبا تھا اور اسے سفر کے اختتام پر ٹھکانہ بھی مل گیا

تھا اور اس نے سرزمین کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی سونگھ لی تھی اور اس نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر دھرتی سے ناتہ بھی جوڑ لیا تھا لیکن رحم علی جو موت کی وادیوں سے لوٹ کر آیا تھا، زندگی سے بھرپور اور جوانی کی مسکراہٹوں سے سرشار روشنیوں میں پروان چڑھ کر جوان ہوا تو اندھیرے سمٹ گئے پر ایک سایہ دل کی اتھاہ گہرائیوں کی ایک دور دراز گپھا میں چوری سے اتر گیا!

اور آج . . . .

آج جب ایک نئی صبح کی پو پھٹ رہی تھی اور شفق کے کناروں پر سُرخیاں پھیل رہی تھیں۔ یہ سایہ پھر سے لرز گیا تھا۔

ایک اور قافلہ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔

ڈیک کے پرلے کنارے گولیاں چل رہی تھیں اور ڈیک کے اس طرف رحم علی کی جوانی رائفل ہاتھ میں لئے سینہ تانے کھڑی تھی اور جمعدار افضل خاں کا پختہ تجربہ پشت پناہی کر رہا تھا۔

اور قافلہ چل رہا تھا۔ منزل ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ جانے پہچانے راستے ان کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہے تھے۔ "فکر نہ کرو راہیو! تم اپنے وطن کی سرزمین پر ہو!"

اور دشمن ڈیک عبور کر رہا تھا!

ڈیک کے چوڑے پاٹ پر سورج کی پہلی کرن چمک اٹھی تھی۔ ریت کے ذرّے

چمک رہے تھے اور پانی کی وہ پایاب دھارا چاندی کی لکیر بن گئی تھی جو خشک سالی کے باعث ریت کے سوکھے ہونٹوں کو سیراب نہ کرسکی تھی۔ وہ جو اندھیرے کی آڑ میں آیا تھا اور نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا تھا، ڈیک کی ریت کی طرح ان گنت تھا اور اس کے پاس ہزاروں ٹینک تھے، توپیں مشین گنیں اور خود کار رائفلیں تھیں۔ اور ابھی اس کی رائفل اور مشین گن نے نہتے دیہاتیوں کے سینوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ ابھی رائفل کی ٹکر رائفل سے نہیں ہوئی تھی۔ اور مشین گن نے مشین گن کا منہ بند نہیں کیا تھا۔ کیونکہ دشمن رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح آیا تھا اور دیہاتی مسلح نہیں تھے اور وہ چین کی نیند سوتے ہوئے تھے۔

اور ڈیک کے اس کنارے سے پہلی بار جھاڑیوں کی اوٹ سے رائفلیں دھاڑیں۔

اور دشمن لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کی رائفل حیرت کے مارے دم بخود رہ گئی۔

تڑ..... تڑ..... تڑ دوسری باڑ آئی اور دشمن کی یلغار رک گئی۔

ڈیک کے اس کنارے دشمن نے موت کو سامنے دیکھا اور اس کا چہرہ اتر گیا۔ کیونکہ وہ زندگی کے لئے لڑنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو موت کا پجاری تھا، اور موت کے پجاری زندگی کا چہرہ بگاڑ سکتے ہیں لیکن موت کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے ہیں اور ڈیک کے اس کنارے زندگی کے رکھوالے سینہ سپر تھے جو موت سے گلے ملنے کو تیار تھے!

اور زندگی شیروں کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ موت ڈیک کے کنارے کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئی۔

اور قافلہ چل رہا تھا اور منزل اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی!

سورج نکل آیا تھا اور مکی، باجرے اور نیشکر کے قدِ آدم پودے دھوپ کا آبحیات پی کر زندگی کی علامت بن گئے تھے۔ سرسبز، شاداب، جوان زندگی جس کی پیشانی پر شبنم کے موتی دمک رہے تھے۔

اور درختوں کے جھنڈ میں سے ایک مسجد کے مینار یوں بلند ہو رہے تھے جیسے وہ نیلے آسمان کی بلندیوں کو چھو لینا چاہتے ہیں اور ان کی تقدس مآب ریت نے صاف شفاف دھوپ کے طاہر و مطہر پانیوں سے وضو کرنے سے خوش آمدید کہا:

"قافلے والو! نئی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے"!

اور پگڈنڈی ان کے قدموں کو چوم چوم کر کہہ رہی تھی:

"سرزمینِ پاکستان کے مہاجرو! تمہیں نئی زندگی مبارک ہو!"

ڈیک کے کنارے تڑ تڑ گولیاں چلیں اور دشمن رُک گیا۔

تڑ تڑ گولیاں چلیں۔ نیشکر کی پھنگیں اڑ گئیں۔

اور قافلہ رُک گیا۔

درختوں کے جھنڈ سے آواز آئی "ہالٹ"

علی محمد حیرت میں پڑ گیا۔ وہ تو دشمن کو ڈیک کے پرے کنارے چھوڑ کر آیا تھا اور تنی ہوئی رائفلوں نے انہیں نرغے میں لے کر کہا، "ہم تیرے اعتماد کا فائدہ اٹھا کر سرحد کے ایک ایک گاؤں میں پھیل چکے ہیں۔ رات کے اندھیرے

ہیں ہم چوروں کی طرح آئے کیونکہ یہ ہمارا پرانا وطیرہ ہے۔ ہم مسلمان نہیں کہ دشمن کو للکار کر اس پر حملہ کریں ہم تو آنکھ بچا کر ڈنڈی مارنے کے عادی ہیں "۔

اور علی محمد کی حیرت دور ہو گئی پر اندھی گپھا میں چھپا ہوا سایہ لرز اٹھا۔

"چلو!" ایک تنی ہوئی رائفل نے گرج کر کہا۔

اور انہیں مسجد کے مینار تلے ایک میدان میں جمع کر دیا گیا۔

علی محمد نے مسجد کے مینار کی طرف ایک نظر دیکھا اور مینار کی ہیبت اس کی بے بس نظروں کی تاب نہ لا کر اور بلند ہو کر آسمان سے ٹکرا گئی اور آسمان کا سینہ شق ہو گیا۔ ایک ننھا سا شگاف ...... اور پھر شگاف کے دریچے سے نور کی ایک کرن پھوٹی ..... اور سایہ سمٹ کر اندھی گپھا میں چل دیا۔

اور رحم علی نے کہا "استاد! میرے پاس صرف دو راؤنڈ باقی ہیں"!

"جوان فکر نہ کرو۔ سپاہی گولی کے بغیر بھی لڑ سکتا ہے۔ ہم نے دو گھنٹوں تک دشمن کو روکے رکھا۔ قافلہ اب محفوظ جگہ پر پہنچ چکا ہوگا۔ بیٹا! ہماری عزت محفوظ ہے"۔ "پر وطن کی عزت"۔ جمعدار افضل خاں نے کہا

"پر استاد ہم گولیوں کے بغیر کیسے لڑیں گے۔ ہمیں اب ہٹ کر گاؤں میں پناہ لے لینی چاہیئے"! اللہ دتا نے کہا۔

"نہیں"! .... جمعدار نے گرج کر کہا "ہم پیٹھ پر گولی نہیں کھائیں گے جوان! موت ان کے پیچھے بھاگتی ہے جو موت سے ڈر کر بھاگتے ہیں"!

دشمن کی رائفلوں نے چیخ کر ان کی غیرت کو للکارا۔ اور جمعدار افضل خاں

اپنے مٹھی بھر مجاہدوں کو لے کر جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا۔ خودکار رائفلوں نے اپنا منہ کھول دیا اور مشین گنیں آگ برسانے لگیں۔ ان کے دہانوں سے شعلے نکلے اور آگ اور شعلوں کو چیرتا ہوا ایک عزم آگے بڑھا اور مشین گنوں سے الجھ گیا اور دشمن دم بخود رہ گیا۔ اور عزم کا سینہ تن گیا۔ دشمن جو ڈیک کی ریت کی طرح ان گنت تھا اور عزم آہنی جو مٹھی بھر مجاہدوں پر مشتمل تھا۔ اس عزم نے اپنے آہنی سینے پر گولیاں کھائیں اور اس کا قدم نہ ڈگمگایا۔ اس نے شہادت کا جام پیا اور بدمست ہو گیا اور اس کے سینے سے خون کا ایک سیلاب امنڈا اور ڈیک کا کنارہ شفق کا لالہ زار بن گیا۔ کتابِ زندگی کے ایک ورق پر سنہری حروف ابھر آئے۔

"ڈیک کے اس کنارے شہیدوں کے خون کی سرخی رنگ لائی ہے"۔

تنی ہوئی رائفلوں نے انہیں نرغے میں لے لیا!

اور رائفل کے کندوں نے مردوں اور عورتوں کو علیحدہ کر دیا۔

رائفل کے اشارے پر مردوں کو درختوں کے گھنے جھنڈ میں لے جایا گیا جہاں مورچے کھودے جا رہے تھے اور ہر مرد کے ہاتھ میں بیلچہ تھما دیا گیا۔ اور سنگینوں کی نوک پر مورچے کھدنے لگے۔ مورچے جہاں توپیں لگ رہی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ میں ٹینک اور جیپیں کھڑی تھیں۔

علی محمد نے بیلچے پر جھکے جھکے مسجد کے مینار کی طرف دیکھا۔

ایک ٹھگنے سے سپاہی نے اسے سنگین چھو کر کہا۔

"مورچہ کھودو"۔

اور اس نے بیلچے کی پہلی ضرب لگائی تو وطن مقدس کی سرزمین کانپ اٹھی مسجد کے مینار کانپ اٹھے اور آسمان سے اترنے والی نور کی کرن کانپ اٹھی اور اندھی گپھا کا سایہ لرز گیا۔

اور مورچہ کھودتے کھودتے علی محمد نے دیکھا کہ عورتوں کی چھانٹی ہو رہی تھی اور نوجوان عورتوں کو ایک طرف کیا جا رہا ہے اور سنگینوں کے سائے میں عورتیں یوں چل رہی تھیں جیسے وہ بھیڑیں ہوں جنہیں مذبح خانے کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ اور ایک سپاہی نے سیماں پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ سیماں جو جمعدار افضل خاں کی بیٹی ہے اور علی محمد کا ہاتھ بیلچے پر یوں جم گیا جیسے وہ لوہے کا پنجہ ہو۔

اندھی گپھا کے سائے نے کہا ”دیکھو! آگے نہ بڑھنا۔ آگے موت ہے!“

اور نور کی لرزتی ہوئی کرن نے کہا ”اس سائے کی بات نہ مانو۔ سیماں تیرے ایمان کی کسوٹی ہے“!

سیماں بپھر گئی۔ اس نے اپنے بازو چھڑا لئے اور علی محمد بیلچہ لے کر لپکا

”سیماں بیٹی! میں آیا۔“

اور ہر بیلچے پر ہر ہاتھ آہنی پنجہ بن گیا

سیماں کے ہاتھ میں ایک بجلی کوند گئی۔ سپاہی کی ایک چیخ بلند ہوئی اور اس کی سنگین نے سیماں کے سینے کا رخ کیا۔

اور سیماں منہ کے بل گر پڑی۔

اور تڑ تڑ ...... گولیاں چلیں۔ ایک شعلہ لپکا اور علی محمد کے دائیں کندھے میں سے بجلی کی طرح گزر گیا۔ گولیوں کی بارش بیلچوں کا سیلاب نہ روک سکی!

دَن ۔۔۔۔۔ دَن ۔۔۔۔۔۔۔ دَن ۔۔۔۔۔۔

سنگینیں تانے ہوئے سپاہی بھاگے اور مورچوں میں کود گئے۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے جہاں جیپیں تھیں، ٹرک تھے اور توپیں لگائی جا رہی تھیں اور مسجد کے مینار کے سائے تلے قافلے کے لوگ کھڑے تھے۔

گڑاڑ ۔۔۔۔۔۔ گڑاڑ ۔۔۔۔۔۔۔ گڑاڑ ۔۔۔۔۔۔۔

آسمان کی بلندیوں پر بادل کی گھن گرج مسلسل ہو گئی تھی اور زمین غبار سے ڈھک گئی تھی اور علی محمد شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ساری دنیا شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ سیماں منہ کے بل زمین پر لیٹی تھی۔ علی محمد نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

اور آسمان کے دریچے سے اترنے والی نور کی کرن نے کہا۔ "چلو! چلو! قدم بڑھاو۔ روشنیوں کی طرف ۔۔۔۔۔"

تڑ ۔۔۔۔۔۔ تڑ ۔۔۔۔۔۔ تڑ ۔۔۔۔۔ ۔۔ دشمن نے پاکستان کے ان نہتے سپاہیوں پر گولیوں کی باڑ ماری۔ جن میں بوڑھے بھی تھے، بچے بھی تھے اور عورتیں بھی۔

دُھم ۔۔۔۔۔۔ دُھم ۔۔۔۔۔۔۔ دُھم گولے برسے "بزدلو! نہتے لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہو، اب ذرا سامنے تو آؤ ۔۔۔۔۔۔ مورچوں سے نکل کر ۔۔۔۔۔۔"

اور مسجد کے مینار دھوپ کا سینہ چیر کر تن گئے۔

مسجد کے مینار ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور آسمان سے اترنے والی کرن انہیں راستہ دکھاتی رہی اور پھر وہ وطن کی محافظ فوج کے کیمپ میں

تھے اور یہاں محبت بھرے ہاتھوں نے ان کے زخم دھوئے اور ان پر محبت کے پھاہے رکھے اور پھر انہیں محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ سیماں کے سینے میں زخم لگا تھا اور اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ زخم گہرا تھا اور اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا "بیٹی! یہ زخم گولی کا تو نہیں"

سیماں نے آنکھیں کھولیں اور اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "جی . . . . . . جی . . . . . . نہیں"

علی محمد بائیں کندھے کے بل لیٹا ہوا سیماں کو دیکھ رہا تھا۔

"پھر تمہیں یہ زخم کیسے لگا بیٹی؟"

"دنجانے . . . . . . جی . . . . اس کی بندوق پر سنگین تھی"

"سنگین!" ڈاکٹر کی آنکھوں کی شفقت حیران بھی ہوئی اور غیظ و غضب میں آگئی۔ "میری بیٹی کو سنگین سے کس نے زخمی کیا؟"

علی محمد بول اٹھا "ایک کمینے سپاہی نے سیماں پر ہاتھ ڈالا۔ میں مورچہ کھود رہا تھا۔ میں نے بیلچہ لے کر اس پر حملہ کر دیا اور اس نے سنگین سے میری بیٹی کا سینہ چھلنی کر دیا ڈاکٹر صاحب"

سیماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک کرن تھرک گئی۔

"نہیں چچا . . . . . میں تیرے پہنچنے سے پہلے اپنے باپ کی نشانی خنجر نکال چکی اور میں نے اسے زخمی کر دیا۔ پھر اس نے سنگین کی نوک سے . . . . . ."

"بیٹی! تم نے؟" علی محمد حیران ہو گیا۔

اور یکایک ڈیک کے اس کنارے پر جمعدار افضل خاں کا رعب دار چہرہ مسکرا اٹھا

"علی محمد! یسماں ایک سپاہی کی بیٹی ہے۔ میں نے اسے اپنی عزت بچانے کا گر سکھا دیا تھا"۔

اور علی محمد نے کہا "ڈاکٹر جی! یسماں جمعدار افضل خاں کی بیٹی ہے جو ہماری پشت پر مورچہ لگا کر بیٹھ گیا تھا کہ وطن کی عزت پر کوئی آنچ نہ آ سکے"۔

ڈاکٹر کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور یسماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرن لرز گئی۔ "مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔ میرا سر اونچا ہو گیا ہے۔ بیٹی! تیرے مقدس سینے کا زخم قوم کی امانت ہے۔ ایک روایت...... تو نے قوم کو زندہ کر دیا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ قوم آج جاگ اٹھی ہے۔ کیونکہ اس کی بیٹیاں چھاتی پر سنگینوں کے زخم کھاتی ہیں لیکن قوم کا سر نیچا نہیں ہونے دیتیں"۔

اس نے یسماں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "زندہ رہنے کی کوشش کرو بیٹی"۔

مسکراہٹ کی کرن چنگاری بن کر چمکی۔

اس نے ایک نظر ڈاکٹر کے چہرے پر ڈالی۔ دوسری نظر علی محمد پر۔

"چچا! ڈیک کے کنارے!"

"ڈیک کے کنارے؟"

"ڈیک کے کنارے ابا کھڑے ہیں اور وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ ان کا تن بدن خون میں نہا گیا ہے"۔

"یسماں بیٹی!" علی محمد کی آواز بھرا گئی۔

اور پھر چنگاری بجھ گئی اور دھند چھا گئی اور یسماں اس دھند میں تحلیل ہو کر آسمان کی طرف پرواز کر گئی اور آسمان سے اترنے والی نور کی کرن اور شوخ ہو گئی۔

لیکن اندھی گپھا کا سایہ لرز اٹھا۔

علی محمد نے دل پر ہاتھ رکھ لیا!

"سیماں بیٹی! تم ہمیشہ زندہ رہو گی" ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم مر نہیں سکتیں!"

سیماں دھند میں تحلیل ہوتی رہی!

اور علی محمد دل پر ہاتھ رکھے رکھے سو گیا اور ڈیک کا کنارا جاگ اٹھا۔ جہاں دھوپ کی تیز روشنی تھی اور ڈیک کے کھلے پاٹ میں ریت چمک رہی تھی۔ اور ریت پر خون کی افشاں تھیں جیسے کہکشاں شفق کی سرخیوں میں ڈوب گئی ہو اور مسجد کے مینار دھوپ میں نہا کر آسمان کو چھو گئے تھے۔

آسمان کے دریچے سے ایک نور کی کرن اتر رہی تھی اور سیماں جو دھند میں تحلیل ہو رہی تھی، اس کرن کے دریچے سے آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔

جمعدار افضل خاں کی مسکراہٹ اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ خون میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ جیسے شفق کی سرخیوں میں ڈوب کر کوئی ستارہ نمودار ہو گیا ہے۔

ڈیک کے چوڑے پاٹ کی چمکتی ہوئی ریت کا ایک ایک ذرہ سرخ ہو گیا۔ نور کی کرن اور نیچے اتر آئی!

اندھی گپھا کا سایہ لرز کر سمٹ گیا!

"علی محمد سنگیا! میں بہت خوش ہوں۔ تو سیماں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا!"

"افضل خاں! سیماں آج بھی زندہ ہے۔ پر میں نے بھی رحم علی کو تیرے سپرد کیا تھا۔"

"علی محمد سنگیا! ذرا ڈیک کے کنارے تو دیکھو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ڈیک کی ریت چمک اٹھی۔

سرخ دھوپ میں سرخ ریت کا ایک ایک ذرّہ چمک اٹھا۔

"بابا میں ہوں تیرا رحم علی، میں ہوں تیرے وطن کا وہ کنارہ جو دشمن کے قدموں سے اس وقت تک پامال نہ ہو سکا۔ جب تک میرے سینے میں خون کا ایک قطرہ موجود تھا۔ میں تو وطن کے ذرّے ذرّے میں خون کی لہر بن کر دوڑ رہا ہوں۔ مجھے ذرا پہچانو۔"

"میں نے پہچان لیا بیٹا!" علی محمد نے آنکھیں کھول کر کہا۔

ہسپتال کے کمرے میں زرد زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی!

ایک دریچے سے نور کی کرن لپک کر آئی۔

کمرہ روشنیوں کے سیلاب سے لبالب پر ہو گیا۔

اور اندھی گپھا کا سایہ لرزا، سمٹا اور پھر اس کا دل ڈھل کر ڈیک کا کھلا پاٹ بن گیا جس پر دھوپ چمک رہی تھی۔

(۳۱ ر اکتوبر ۱۹۶۷ء)

نغمہ
اور
آگ

نغمہ اور آگ

"وہ بھی آپ ہی کی طرح کا ایک شاعر تھا" کرنل صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"کون؟"

"میری جیپ کا ڈرائیور" کرنل صاحب بولے

"اب وہ کہاں ہے؟"

"کہاں ہے؟ .... وہ اگلے مورچوں میں تھا" کرنل صاحب نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"لیکن ..... لیکن ..... وہ قید ..... نہیں وہ قید نہیں ہو سکتا"

کرنل صاحب مسکرائے اور ان کی مسکراہٹ میں دکھ کی لہر بھی تھی۔

میں نے سوچا،

شاعر قید نہیں ہو سکتا!

نغمے کی پرواز کو کون پابند سلاسل بنا سکتا ہے۔ نغمہ تو پابندِ نے کبھی نہیں ہوا
کرتا اور نغمہ کارزارِ حیات میں ہمیشہ اگلے مورچوں پہ رہتا ہے۔ وہ نہ قید ہو سکتا ہے
اور نہ مر سکتا ہے، کیونکہ وہ ازلی اور ابدی ہے۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اُس شاعر کو میں نے اپنے گاؤں میں دیکھا۔

یہ گاؤں اس کا بھی ہے اور میرا بھی۔ یہ گاؤں ہرے بھرے درختوں کے
جھنڈ میں گھرا ہوا ہے اور اس کے لہلہاتے کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور
ان کھیتوں میں چاندی کی دھاریں بہہ رہی ہیں اور بل کھاتی پگڈنڈیاں دھوپ اور
چاندی میں چمک رہی ہیں۔ اس گاؤں کے جنوب میں ایک برساتی نالہ ہے۔ جو
نیلے پہاڑوں سے جنم لیتا ہے اور گاؤں کی تین اطراف سے ہم آغوش ہو کر بہتا
چلا جاتا ہے۔ اس میں سارا سال پایاب پانی بہتا ہے اور اتنا صاف ہے کہ اس
کی تہہ میں ریت چمکتی ہے۔ اس کے کنارے پر شیشم کے درختوں کا سایہ ہے اور
جب برسات میں ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے تو یہی نالہ اپنے کناروں سے
چھلک جاتا ہے۔

میں نے نالے کے پایاب پانی میں ننگے پاؤں رکھے تو رگ رگ میں خنکی کی
لہر دوڑ گئی۔

میرا گاؤں سرِ شام ہی سو گیا تھا!
میرا گاؤں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

مَیں قہقہے کی تیز روشنی کے سیلاب سے بھاگ کر آیا تھا ۔کیونکہ مجھے روشنی کی تلاش تھی ۔ پانی چپ چاپ بہہ رہا تھا کائنات اندھیرے میں ڈوب کر زندگی کی خاموش لے بن گئی تھی۔

یکایک فضا تھرتھرا گئی ۔

اندھیرے جھوم اٹھے اور پایاب پانی کی مدھر لَے رقص کرنے لگی۔ میں نے یوں سمجھا جیسے بانسری کا نغمہ میری طویل جدائی کا شکوہ کر رہا ہو۔ میں نے دوسرے کنارے پر پاؤں رکھے اور جوتے پہن لئے ۔

"کون ہو بھئی ؟" نغمے نے پوچھا

"ایک مسافر جو اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے "

"مسافر بھی کہیں منزل پر پہنچا کرتے ہیں "۔ میں چونک گیا، لیکن نغمہ میرا خیر مقدم کر کے پھر اپنی لَے میں کھو گیا تھا۔ میں نغمے کے جادو کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے قدم بڑھا لئے۔نغمہ کچھ دور تک میرا ہم سفر رہا۔ سوئے ہوئے گاؤں کی گلی نے مجھے نگل لیا ۔

اور نغمہ گاؤں سے باہر رہ گیا، کیوں کہ اسے اندھیری گلیوں سے نفرت ہے ۔

صبح بڑی پر سکون تھی !

گندم کی نو شگفتہ کونپلوں کی نوک پر شبنم کے قطرے لرز رہے تھے کھیتوں کی منیڈھوں کی گھاس بھیگی ہوئی تھی اور بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی نالے کے کنارے پر درختوں کی گھنی چھاؤں تلے سو گئی تھی ۔یہیں ایک نغمے نے مجھے خوش آمدید کہا تھا۔

"وہ کون تھا؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

وہ نالے کے کنارے شیشم کے دو درختوں کے درمیان دھوپ میں کھڑا تھا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کی مسکراہٹ میں دھوپ تھی اور آنکھوں میں خوابوں کے سائے!

وہ میرے گاؤں کا شاعر تھا۔ یہ شاعر جو کبھی کبھار کسی گاؤں کو نصیب ہوتا ہے۔

حسن دین نے کہا "آپ کہہ رہے ہیں، وہ شاعر ہے۔ ہم تو اسے پگلا سمجھتے ہیں۔"

"نہیں حسن دین، وہ شاعر ہے!"

"شاعر تو ہیر رانجھا لکھتے ہیں میاں جی!"

"رانجھا بھی تو شاعر تھا۔"

"یہ کس کی باتیں ہو رہی ہیں؟" لال دین راہ چلتے چلتے رک کر پوچھنے لگا۔

"نورے کی، میاں جی کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہے۔"

"میاں جی! نورے نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ ہمیں تو خیال تھا وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔ گاؤں کی عزت بڑھے گی پر......" لال دین نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"پر اسے کیا ہوا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"حسن دین! تم ہی ساری کہانی سنا دو میاں جی کو۔ میں ضروری کام پر جا رہا ہوں۔"

حسن دین نے کہا "بیٹھ جاؤ میاں جی"۔
میں کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔
"میاں جی! نورے کو آپ نے بچپن میں دیکھا ہوگا۔"
"کچھ یاد نہیں پڑتا حسن دین"۔
"وہ بچپن ہی سے نرالی طبیعت کا مالک تھا۔ شکل صورت سے وہ جاٹ کا بیٹا معلوم نہیں ہوتا تھا"۔
وہ ان بچوں میں سے تھا جو اپنے ماحول سے الگ الگ لگتے ہیں۔ حساس اور خاموش جیسے ہر دم کوئی خواب دیکھتے ہوں اور ان کا عکس ان کے چہروں سے جھلکتا ہو۔
وہ بچپن سے ہی پگلا تھا۔
وہ ایک دن مدرسے سے آیا تو رو رہا تھا۔ اس کی ماں نے دلاسا دے کر وجہ پوچھی تو وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔
"تجھے کیا ہوا نورے؟" اس کی ماں نے پوچھا۔ "منشی جی نے مارا؟"
"نہیں تو ۔ ۔ ۔"
"کسی لڑکے سے لڑ پڑے؟"
"نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔"
"پھر کیا ہوا تجھے؟"
"بلّو مر گئی"
"کون بلّو؟" اس کی ماں حیران ہو گئی۔

"اُس کے پلّے رو رہے تھے۔"

"بلّو..... کتیا....." اس کی ماں نے حیران ہو کر کہا۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"وہ تیری کیا لگتی ہے نورے؟" اس کی ماں کے لہجے میں طنز تھا۔

"پلّوں کا کیا ہوگا ماں۔ وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔"

"مر جائیں گے ایک ایک کر کے۔"

"نہیں....." اس نے آنسو پونچھ کر کہا "میں انہیں پال لوں گا۔"

اُس نے پلّوں کے لئے ڈربہ بنایا۔ پیالی بنائی اور انہیں صبح شام دودھ پلاتا رہا اور وہ پلّے بڑے ہو کر گلیوں میں آوارہ ہو گئے۔

"یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے میاں جی؟" حسن دین نے پوچھا۔

"نہیں تو....." میں نے کہا۔

نورا پڑھائی لکھائی میں بڑا ہوشیار تھا۔ اُسے دھرتی سے بڑا پیار تھا۔ وہ کھیت کھیت پھرتا۔ اُسے ایک ایک بوٹے سے پیار تھا اسے فصل فصل کا علم تھا۔ وہ اس دھیمی سی خوشبو سے بھی آگاہ تھا جو فصل کے بچپن کو اس کی جوانی سے جدا کرتی ہے۔ اسے ہوا کے جھونکوں کے اسرار کا علم تھا۔ اسے پتّے پتّے سے محبت تھی اور پھر وہ جوان ہو گیا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ دسویں پاس کر چکا تھا اور چوہدری رحمت علی نے کہا تھا کہ نورا گاؤں کا سپوت ہے۔ ہم اسے چودھویں پاس کرائیں گے۔" حسن دین نے کہا۔

چوہدری رحمت علی کوئی بڑا آدمی نہ تھا، لیکن اسے ملنے جلنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ تحصیل تھانے میں اس کی خاصی واقفیت تھی۔ نورا چودھویں کر لیتا تو اسے ضرور افسری مل جاتی۔ یوں بھی چوہدری اسے اپنا بیٹا بنا لیتا۔

" اور کمبخت نورے نے اسی سے ٹکر لے لی!"

" وہ کیسے ؟" میں نے پوچھا۔

"چوہدری رحمت علی کا آبائی مکان گاؤں کے اندر تھا۔ مکان تنگ تھا۔ اور اس میں کسی مہمان کو ٹھہرانے کی گنجائش نہ تھی۔ گاؤں سے باہر شاملاٹ دیہہ کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر چوہدری اپنی حویلی تعمیر کرنا چاہتا تھا اور گاؤں کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ کیونکہ چوہدری کی حویلی بن جاتی تو سارے گاؤں کی عزت بن جاتی تحصیل تھانے کے افسر اسی میں آکر ٹھہرتے، لیکن اس ٹکڑے پر ایک خانہ بدوش جھونپڑی بنا کر رہ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے خالی نہیں کر رہے تھے۔ چوہدری نے صلح صفائی کی بہتیری کوشش کی پر وہ نہ مانے۔

ایک دن چوہدری گاؤں کے لوگوں کو ساتھ لے کر خانہ بدوشوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ جگہ خالی کر دیں نہیں تو گاؤں کے لوگ زبردستی نکال باہر کریں گے۔ خانہ بدوش تین نسلوں سے اس زمین پر بس رہے تھے۔ وہ ایک ایک کی منت کر رہے تھے۔ کبھی وہ اپنی جھونپڑیوں کی طرف دیکھتے جہاں چولہوں میں آگ سلگ رہی تھی اور دھواں اٹھ رہا تھا وہ کبھی ایک چہرے کو دیکھتے، کبھی دوسرے پر نگاہیں جما دیتے، لیکن انہیں ہر چہرے نے مایوس کیا اور انہیں کسی آنکھ میں ہمدردی کی کرن بھی نہ مل سکی۔ وہ مایوس ہو گئے۔ ایک دو بوڑھی خانہ بدوش

عورتیں رو پڑیں ۔ اس وقت نُورا میدان میں آگیا۔

اس نے کہا " لوگ تو کسی پنچھی کا گھونسلہ بھی نہیں اجاڑتے ۔ یہ تو انسان ہیں۔"

اُس کے باپ نے کڑک کر کہا " نورے ! تم بڑوں کی بات میں کیوں بولتے ہو ۔"

" بابا یہ لوگ کہاں جائیں گے ۔"

" تم پڑھ لکھ کر بے ادب ہو گئے ہو ۔"

" نہیں بابا ! میں بزرگوں کا غلام ہوں پر بزرگ انصاف کی بات نہ کریں تو میں اپنی آواز ضرور اٹھاؤں گا ۔"

نورے کے باپ نے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لئے اور تابڑتوڑ اس پر گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی ۔ وہ سر جھکا کر مار کھاتا رہا ۔ اس نے اف تک نہ کی۔

اس کا باپ مارتے مارتے تھک گیا ۔ نورے کا چہرہ سرخ تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا پر اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا ۔ اس کے باپ نے پوچھا " کہو نورے ، اب بھی بولو گے ۔"

اس نے سر جھکا لیا ۔

خانہ بدوش قبیلے کا چہرہ غم سے اتر گیا ۔

اس نے چند لمحوں کے بعد کہا ، " بابا ! میں ان چولہوں کی آگ کو سرد ہوتا ہوا نہ دیکھ سکوں گا ۔

اور اس کی آنکھوں میں ایک آنسو چمک اٹھا ۔

چوہدری نے کہا۔ "کیا دیکھتے ہو۔ یہ تو پگلا ہے۔ جھونپڑیوں کو اکھاڑ کر پھینک دو۔"

کچھ لوگ آگے بڑھے، لیکن نورے کی جرأت اپنا کرشمہ دکھا گئی تھی۔ گاؤں کے جوان ان کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور خانہ بدوش قبیلہ وہیں پر چھا رہا لیکن چوہدری رحمت علی، نورے سے ایسا ناراض ہوا کہ نورا دسویں پاس کرنے بعد آگے نہ پڑھ سکا۔

"پھر نورا شاعر بن گیا؟"

"نہیں ابھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" حسن دین نے کہا اور خاموش ہوگیا۔

"کیا نورے نے کوئی ایسی بات کی کہ گاؤں کی عزت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں! میاں جی! نورا تو گاؤں کی عزت کا ساجھی ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم گاؤں والوں نے اپنے ایک بیٹے کو اپنے ہاتھوں آپ کھو دیا۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا بتاؤں میاں جی! میں نے ابھی ابھی کہا تھا نا کہ چوہدری، نورے کو اپنا بیٹا بنا لینے پر تیار تھا، پر اس کے دل میں ایسی گانٹھ پڑی کہ اس نے سب رشتے توڑ دیئے۔"

زینت اور وہ بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک دھرتی کی آغوش میں پروان چڑھے تھے اور ان کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ وہ ایک ہی خاندان کے دو فرد تھے ان کا آنگن ایک نہیں تھا پر دلوں کے آنگنوں میں کوئی فاصلے نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ اتنا قریب رہے کہ وہ جب بھی دل کی اوٹ سے جھانکتے

تو ایک دوسرے کو آنگن میں چلتا پھرتا دیکھ لیتے۔ ان کی محبت نسیم صبح کا ایک معطر جھونکا تھی کہ جس سے ایک پتہ بھی نہیں لرزتا۔ اوس کا ایک قطرہ اس سے کلی کا آنچل بھی نہیں بھیگ سکتا۔ اتنی دھیمی، اتنی خاموش اتنی گھمبیر محبت کہ جذبات کی سطح پر ایک لہر بھی تو نہ اٹھی۔ اتنا خاموش نغمہ کہ اس سے کوئی دوسرا کان آشنا تک نہ ہو سکا۔ جب چوہدری رحمت علی نے زینت کا رشتہ کہیں اور کر دیا تو نورے نے اف تک نہ کی۔

"پھر وہ کھیتوں میں آوارہ پھرنے لگا،" حسن دین نے کہا۔ "اور اس نے بانسری منہ سے لگالی کہ بانسری کی بات کوئی کوئی سمجھتا ہے۔ وہی جس کے دل میں درد ہو۔ کیوں میاں صاحب؟"

"ٹھیک ہے حسن دین!" میں نے کہا۔

نورا کھیتوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ اس کے دوست اس کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے۔ ایک نے کہا "نورے! تو تو مٹی کا ڈھیر نکلا۔ ہم تو تجھے بڑا جیالا سمجھتے تھے جرأت سے کام لے اور......"

"نہیں!" نورے کی آواز میں شعلوں کی لپک تھی "میں اس گاؤں کا سپوت ہوں۔"

پھر زینت کی برات آئی۔

زینت کو ڈولی میں بٹھا دیا گیا۔ برات رخصت ہو رہی تھی کہ نورا پھرتا پھراتا آ نکلا۔ آوارہ حال، پریشان بال نورا ہجوم میں شامل ہو گیا۔ چوہدری جو بیٹی کی رخصتی پر رو رہا تھا، پلو سے آنکھیں پونچھ کر بولا۔ "یہ تو نورا ہے!" اس

کی آواز میں خوف کی جھنجھناہٹ تھی ۔ جیسے کانچ کا کوئی ٹکڑا زمین پر گر پڑا ہو۔ "یہ تو نورا ہے۔ یہ پاگل ۔ یہ خبطی۔ یہ کہاں سے آگیا۔ میری عزت خطرے میں ہے۔ پوری بارات کے سامنے اس نے کچھ کہہ دیا تو؟" اس کا ماتھا پسینے سے تر ہو گیا۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ڈولی اٹھا لو۔"

زینت کے بھائی ڈولی اٹھانے کے لئے بڑھے اور نورا بھی ..... چوہدری کانپنے لگا..... وہ عزت کے خیال سے بول بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے نورے کی طرف بڑی بے بس نگاہوں سے دیکھا ان کی نظریں ایک لحظہ کے لئے ملیں اور دوسرے لمحے چوہدری نے یوں محسوس کیا جیسے کسی ٹھنڈی لہر نے اس کی تپتی پیشانی پر پیار کا پھاہا رکھ دیا ہو۔

نورے نے زینت کے بھائیوں کے ساتھ مل کر ڈولی کو کندھا دیا اور شہنایاں رخصتی کا نغمہ بجانے لگیں۔ ہر آنکھ نم آلود ہو گئی۔ گلی گلی رو پڑی۔ در و دیوار رو پڑے اور دھرتی کی آنکھ سے آنسو نکل آئے۔ خوشی کے آنسو........ غم کے آنسو........ کیونکہ دھرتی ماں ہے۔ وہ اپنے ایک بیٹے کی محرومی پر رو دی۔ لیکن اس کی عزت پر حرف نہ آیا تھا، اس لئے اس کی آنکھوں سے خوشی کا دھارا بھی پھوٹ بہا تھا۔

"اب وہ مست موجی آدمی ہے۔ جی میں آیا تو گھر آ گیا۔ دل چاہا تو کچھ کھا لیا۔ کبھی ہل کے ہتھے پر ہاتھ رکھا تو کھیت جوت ڈالے اور جی نہ مانا تو پانی کا کیارا موڑنے سے بھی انکار کر دیا۔"

"حسن دین! میرے گاؤں نے واقعی ایک بہت اونچے انسان کو ہاتھوں

سے کھو دیا ہے۔" میں نے کہا۔

لیکن میں نے کتنی غلط بات کہی تھی۔

کیونکہ وہ عظیم انسان جو شاعر تھا، کرنل صاحب کی جیپ کا ڈرائیور تھا اور اس کے بازو پر تین تیلیاں تھیں۔ حوالدار نور زماں، جس کے گاؤں میں آج بھی ہل چل رہے تھے اور کنوؤں کی چاندی کھیتوں کے پارس سے چھو کر سونا بن رہی تھی۔

اس کی جیپ اگلے مورچوں کی طرف چل رہی تھی۔ کرنل صاحب ایک ضروری میسج لے کر جا رہے تھے جو وائرلیس پر دیا جاتا تو اس کے انٹرسیپٹ ہونے کا خطرہ تھا۔ اور جیپ کا ڈرائیور شاعر تھا، حالانکہ اس نے ایک شعر بھی نہ کہا تھا۔ اگلے مورچوں پر اولوں کی طرح گولے پھٹ رہے تھے۔ اور دھول کا بادل اٹھ رہا تھا۔

"نور زماں!" کرنل صاحب بولے

"یس سر۔"

"جیپ یہیں کھڑی کر دو۔"

اس نے ایک درخت کے نیچے جیپ کھڑی کر دی۔ کرنل صاحب جیپ سے نیچے آئے۔ حوالدار نور زماں نیچے اتر کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔

اس نے سلوٹ مار کر کہا "صاحب! میسج میں پہنچاؤں گا۔"

"نہیں۔"

اس نے سر جھکا لیا اور دھیمے سے کہا "صاحب، میسج میں پہنچاؤں گا۔"

کرنل صاحب نے اسے میسج دے دیا۔ نور زماں اگلے مورچوں کی طرف

بڑھ گیا۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کرنل صاحب نے جیپ موڑ لی اور پچھلے مورچوں میں آ گئے۔

پھر وائرلیس پر انہیں معلوم ہو گیا کہ پیغام مل گیا ہے۔ اور ان کے ڈرائیور کو واپس کر دیا گیا ہے۔

لیکن نور زماں واپس نہ آیا۔

"وہ قید نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اسے کیا ہوا۔۔۔۔۔ کرنل صاحب سوچنے لگے "کہیں وہ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نغمہ نہیں مر سکتا۔۔۔۔۔"

حوالدار نور زماں اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔

لیکن شاعر نور زماں نے ایک مورچے میں ایک مشین گنر کو دیکھا۔ جس کے ہاتھ ٹریگر پر تھے، اور اس کے سینے میں گولی لگ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ خون آلود مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ شاعر نور زماں نے اسے گود میں لے لیا۔ اس کے ہونٹوں پہ بوتل سے پانی کے قطرے اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جہاں ایک ادھوری مسکراہٹ جامد ہو کر رہ گئی تھی۔ شاعر نور زماں کا دل بجھ کر رہ گیا۔ موت سبقت لے گئی تھی۔ ابھی اس کی انسانیت اپنا فرض ادا نہ کر سکی تھی۔ دوسرے لمحے ایک روشنی ہوئی "میں تیرا ادھورا فرض پورا کروں گا دوست!" اور اس نے لبلبی پر انگلی رکھ کر اسے دبا دیا۔ دھواں اٹھا۔ دھول اڑی اور نغمہ آگ برسانے لگا اور پھول بکھرنے لگے، کیونکہ آگ میں بھی پھول ہوتے ہیں اور ہوا چلتی رہے۔ سائے لرزتے رہے اور درخت جھومتے رہے۔

دور زینت کے گاؤں میں دھوپ سایوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی

اور پھر شام پڑ گئی ۔ اندھیرا ہوا اور چاند نکل آیا اور زینت نے دیکھا کہ چاند اس کے آنگن میں اتر آیا ہے ۔ زمین پر بانسری کے ایک نغمے نے اس کا استقبال کیا ہے ۔ پھر نغمہ اور چاند، زمین اور آسمان گلے مل گئے ہیں اور چاند نے زمین کے ایک بیٹے کی پیشانی کے گرد نور کا ہالہ کر دیا ہے ۔ کیونکہ اس نے نغمے کی تخلیق کی تھی ۔ یہ نغمہ جو پھول بن کر کھل اٹھا تھا ۔

(۵ر دسمبر ۱۹۶۵ء)

سبز پوش
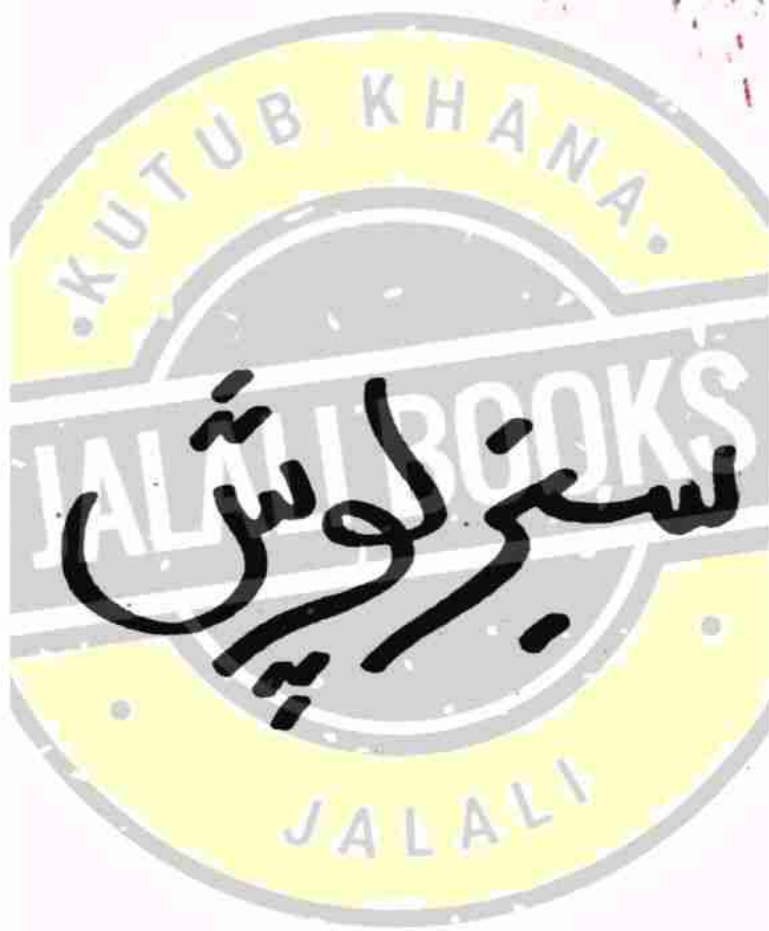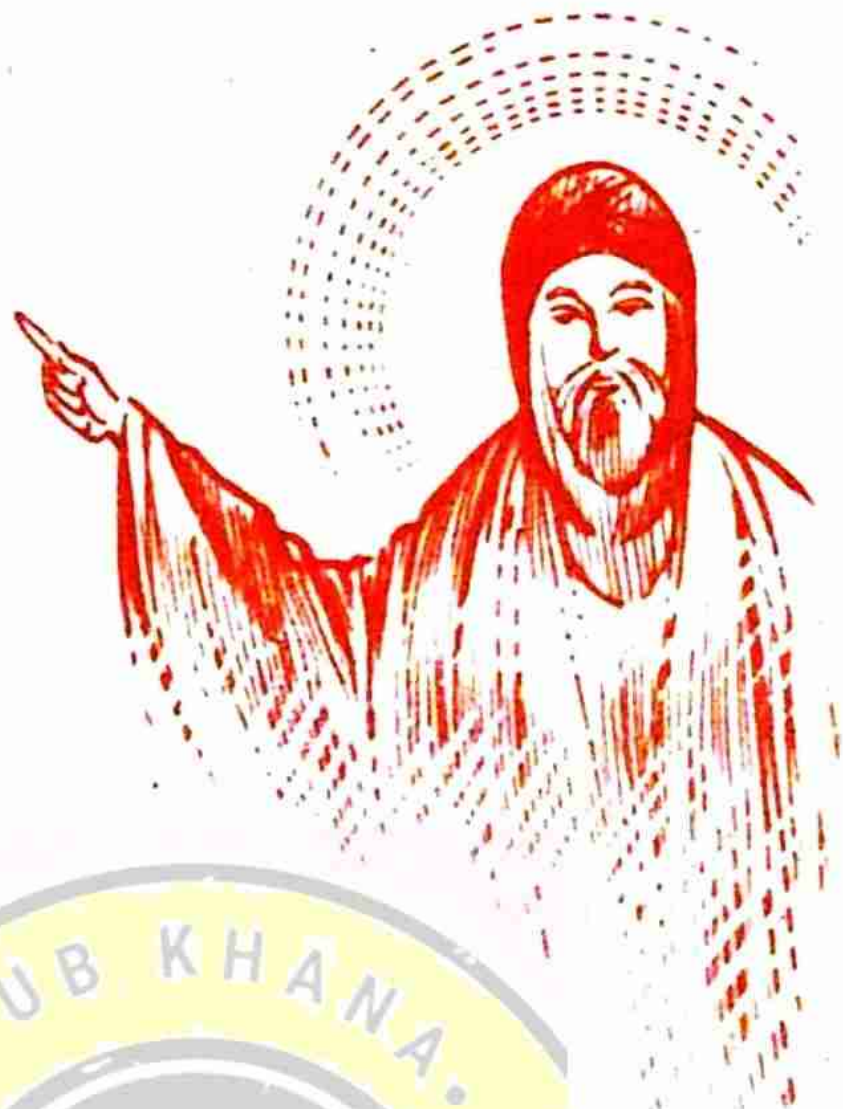
پُل کے اوپر ایک جیٹ سپر سانک طیارے نے آواز کی حد کو توڑا ! ہوائی توپ چلی۔ شہر کی طرف سے سائرن کی خوفناک آواز آئی۔ اس کے سارے جسم پر ایک جھرجھری سی طاری ہوگئی۔ پل کے دونوں طرف بسیں، ٹرک، کاریں اور سائیکل رک گئے۔ وہ سائیکل سے اترا تو اس کے قدم ڈگمگا گئے۔

اس پل نے اس کی زندگی کے دو کناروں کو جوڑ رکھا تھا اور آج ..... آج اُس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک لمبے خلا کے ایک سرے پر کھڑا ہو اور دو کناروں کو ملانے والا کوئی پل موجود نہ ہو۔ کیا یہ اس کی نظر کا واہمہ تھا؟ ...... نہیں ..... وہ بزدل نہیں تھا.... . جنگ کے سولہ دن گزر چکے تھے۔ ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا تھا کہ وہ ڈر گیا ہو۔ اب تو وہ اس کا عادی بن چکا تھا۔ اس دوران سپر سانک طیاروں نے کئی بار آواز کی حد کو توڑ کر فضا کو لرزہ براندام کیا تھا، اس نے گھر میں بچوں سمیت

سیڑھیوں تلے پناہ لی تھی، دفتر میں وہ بڑے اطمینان سے خندق میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔
اور اسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

اور آج ......۔

آج یہ پُل موجود نہیں تھا۔

اس نے سوچا۔ "زندگی کے خلا کو عبور کرنے کے لئے پل کی ضرورت ہے۔ اب میں کیا کروں؟ اب میں کہاں جاؤں؟ میں جو شہر سے گھر جا رہا تھا۔ میری زندگی کا یہ خلا کیسے عبور ہوگا؟ میں تو اپنی دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔ میں نے ٹالسٹائی کی جنگ اور امن، پڑھی تھی اور میں نے اپنے لئے 'امن' کو چن لیا تھا۔ 'اے فیر ویل ٹو آرمز' میں میں نے جنگ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا تھا۔ 'آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ' کے بعد ہیروشیما اور ناگاساکی پر دو ایٹم بم گرے تھے اور مشرق کے محاذ پر بھی موت کی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ موت اور امن..... امن اور موت.....؟"

اور وہ اونچی سڑک کی ڈھلوان سے نیچے اتر گیا۔

وہ ایک گڑھے میں بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر شیشم کے درختوں کا گھنا سایہ تھا۔ اس کا جسم دھرتی کی آغوش سے مس ہو رہا تھا۔

دوسری بار ہوائی توپ چلی۔

وہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ دھرتی نے کوئی محبت بھرا کلمہ کہا کہ اسے نیند آ گئی
دھرتی انسان کی ماں ہے۔ اس کا ملجا و ماوا۔ وہ اسی کے رحم سے نکلا ہے۔ اسی میں داخل ہو گیا۔

صبح صبح اس نے خبر سنی تھی کہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔

اسے اس کا یقین نہ آیا تھا۔ اس کی بیوی نے گھبرا کر پوچھا تھا "جنگ شروع ہو گئی ہے؟"

"سنا تو ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ زندہ قوموں پر ایسے وقت آیا کرتے ہیں۔"

اس کے بچوں نے اس کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا تھا۔

اس نے سوچا تھا "وہ نسل جو جنگ کی بھٹی میں سے گزر جائے، کندن ہو جاتی ہے۔ کندن یا خاک؟"

اُس کے ضمیر نے اسے ٹوک کر کہا "جمود اور امن نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے۔ قومیں جنگ میں اپنے آپ کو دریافت کرتی ہیں۔ امن تو موت کی نیند ہے۔"

اور اس دن جب وہ دفتر سے واپس اپنے گھر آ رہا تھا تو پل پر بڑا ہجوم تھا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان، گائیں، بھینسیں، بکریاں، تانگے، چھکڑے، سائیکل سروں پر گٹھڑیاں، چہرے گرد آلود۔ آنکھوں میں تھکن۔

"تم کس گاؤں سے آئے ہو؟" اس نے ایک بوڑھے کسان سے پوچھا تھا

"ڈوگرائی سے۔"

"کس طرح؟"

"کس طرح؟" بوڑھے نے حیران ہو کر سوچا "بھاگ کر!"

ایک گرد سے اَٹے سفید بالوں والی عورت نے کہا "کہو!"

"بھاگاں! میں تو غفلت کی نیند سویا ہوا تھا۔ وہ آواز تم نے سنی تھی؟"

"ہاں! وہ آواز گاؤں کی مسجد کے مینار سے آ رہی تھی۔ لوگو! جنگ شروع ہو گئی۔ گاؤں چھوڑ دو!"

"یہ آواز دینے والا کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی اللہ کا بندہ ہو گا۔ میں گنہگار کیا جانوں اس کے بھید؟ جب ہم گاؤں سے نکلے تو ہمارے پیچھے توپیں چنگھاڑ رہی تھیں اور گولیاں چل رہی تھیں۔ نوراں کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ چل رہی ہے۔ فکر نہ کرو۔" بھاگاں نے جواب دیا۔

"یہ نوراں کون تھی؟"

وہ تو ایک شرمائی لجائی لڑکی تھی جس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور جس کی دوشیزگی رستے کی دھول میں اَٹ کر اور نکھر آئی تھی۔ اس کا چہرہ دھوپ میں تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ آواز اس کی آنکھوں کی چمک بن گئی ہو اور اس کی پشت پناہی کر رہی ہو۔

"میں نے یہ چمک پہلے کہاں دیکھی تھی؟" اس نے سوچا۔

"ڈوگرائی میں یا گلبرگ میں؟ کپاس کے کھیت میں یا سرخ گلاب کی جھاڑیوں میں؟ وہ کپاس چن رہی تھی یا گلاب کے پھول توڑ رہی تھی؟ اس کی انگلیوں میں کتنی پھرتی، لچک اور توانائی تھی جیسے بجلی کی رو تتلی بن کر اڑ رہی ہو۔"

وہ کپاس کے کھیت کی رانی تھی۔

دور دور تک سفید کپاس کھلی ہوئی تھی۔

اور گلاب کے پھول . . . .

وہ گلبرگ کی ایک خوبصورت کوٹھی کے لان میں کھڑی تھی۔

وہ اس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن گلاب کی جھاڑیوں میں وہ نور جہاں معلوم ہو رہی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں گلاب کا پھول اس کے رخساروں کو چھو رہا تھا اس کی آنکھوں میں شاہانہ تمکنت تھی جیسے وہ کل کائنات کی ملکہ ہو اور شباب نے اس کے وجود میں اگر ارتقائے حیات کی معراج پالی ہو۔

وہ ایک دو لمحے کے لئے ٹھٹکا تھا۔ پھر اپنے رستے پر چل پڑا تھا کہ کہیں، غیرت حسن اسے غیر نہ سمجھ لے حالانکہ وہ اس کا محرم راز تھا۔

اور اسی پل کے اِس سرے پر وہ اس کی کار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ سائیکل اس کے گھٹنوں میں تھا۔ پل اس دن خلا کے کناروں کو ملا رہا تھا۔ ٹریفک رُکی ہوئی تھی۔ کار لبالب بھری ہوئی تھی۔

اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں گلاب کا پھول نہیں تھا۔ اس کی آنکھ میں چمک نہیں تھی۔

"کائنات کی ملکہ نجانے کیوں خائف ہے؟" اس نے سوچا اور اس کا دل بھر آیا تب اسے اچانک غصہ آیا۔

"وہ گلبرگ کا تختہ گلاب چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے؟ اس کی آنکھوں میں چمک کیوں نہیں؟ کیا اس نے وہ آواز نہیں سنی تھی جو ڈوگرائی کی مسجد کے مینار سے بلند ہوئی تھی"

"دشمن جوڑیاں کلاں میں آدھی رات کو داخل ہوا۔ لوگ بچ بچا کر نکل آئے۔ کچھ چونڈہ میں آئے، کچھ سیالکوٹ میں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب محفوظ پہنچ گئے۔ اپنی خیریت سے مطلع کرو۔"

یہ اس کے دوست کا خط تھا جو سیالکوٹ سے ۹ تاریخ کو چلا تھا اور گیارہ کو اُسے ملا تھا۔ اس خط میں سے اُسے اُس بم کی آواز نہ آئی جو سیالکوٹ پر گرا تھا، نہ اس میں چونڈہ کی اس لڑائی کا ذکر تھا جس میں ٹینک آپس میں ٹکرائے تھے اور تاریخ کے صفحات گونج اٹھے تھے۔ ان میں ایک خوفناک اور تابناک باب کا اضافہ ہوا تھا۔

اس کا اپنا گاؤں بھی تو گولہ باری کی زد میں آگیا تھا۔

اس کے والد نے لکھا تھا، "ہم گاؤں چھوڑ کر ادھر ڈسکے آگئے ہیں۔ کوئی فکر نہ کرو۔"

اور وہ روز پل پر سے گزر کر شہر اُتارہا کیونکہ اس نے اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ رات توپوں کی دَن دناہٹ کے نغمے سننے میں گزرتی۔ نیند پھر بھی آجاتی۔ ایک ایک رات میں تین تین بار خطرے کا سائرن بجتا اور وہ سیڑھیوں کے نیچے پناہ گاہ میں چلے جاتے اور ایک بار تو ایسا ہوا کہ سائرن بجتا رہا اور گھر میں سے کوئی بھی نہ جاگا۔ اس نے سوچا تھا "میں انہیں جگا کر کیوں پریشان کروں۔ موت سے کون بچ سکتا ہے۔"

پھر ایک روز اسی پل پر سے گزر کر وہ اپنے گاؤں پہنچا کیونکہ اس دن یہ پل محفوظ تھا۔ اس کے گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا اور توپیں گرج رہی تھیں۔ اور

گاؤں سے باہر کنویں رُوں رُوں چل رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے عورتوں اور بچوں کو گولوں کی زد سے دور محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا تھا۔ بس گاؤں سے یہی ایک دو میل آگے۔ مرد دن بھر کھیتوں میں کام کرتے، ہل چلاتے اور سرِ شام کام چھوڑ کر خندقوں میں پناہ لے لیتے۔

سیالکوٹ شہر میں دکانیں کھلی تھیں۔

اقبال چوک میں بڑا ہجوم تھا۔

اس نے پوچھا "یہ ہجوم کیوں؟"

"ابھی ابھی قیدیوں کی لاریاں یہاں سے گزریں گی"

اُسے غصہ آگیا۔ یہ لوگ جنگ میں بھی تماشہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ کتنی غیر سنجیدہ قوم ہے جو جنگ کو جنگ نہیں سمجھ رہی۔ یہاں سے محاذ ہے بھی کتنی دور رات کی خاموشی میں تو ہیں تو ایک طرف رائفلوں اور برین گنوں کی آوازیں بھی صاف سنائی دیتی ہیں۔ توپوں کے گولے شہر کے اندر گرتے ہیں۔ قوم کو تو پناہ گاہوں میں چلا جانا چاہیے تھا۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ سائرن بجا۔

اس کے کانوں میں سنسناہٹ سی ہوئی اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگنے لگے یہ غیر سنجیدہ قوم! جنگ کو بازیچہ اطفال سمجھ رکھا ہے اِس نے!

مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ لوگ بادِل نخواستہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس نے بھی ایک دکان کے چھجے تلے پناہ لے لی۔

"تم یہاں؟" اس کے دوست نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! میں تمہاری طرف آ رہا تھا۔"

"تم لاہور سے کب آئے؟"

"آج ہی..... گاؤں سے ہو کر آ رہا ہوں"

"ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم سیالکوٹ والے بہت دلیر ہیں اب معلوم ہوا کہ لاہور والوں کا دل گردہ بھی فولاد کا بنا ہوا ہے۔"

سائرن بجا۔

فضائی حملے کا خطرہ دور ہوا تو وہ دونوں ٹرنک بازار کی طرف چل پڑے سارے بازار کے دروازے ٹوٹے ہوئے تھے اور کھڑکیاں چور چور تھیں گھاس منڈی سے ذرا آگے ملبے کے ڈھیر تھے اور تلے کی عمارتوں میں لمبی لمبی دراڑیں منہ کھولے تھیں لیکن پیر مراد کی قبر پر قرآن شریف یوں پڑے ہوئے تھے جیسے ابھی کسی نے انہیں غلافوں میں لپیٹ کر ترتیب سے رکھا ہو۔

ان ڈھیروں کو دیکھ کر ایک غیر ملکی صحافی رو پڑا تھا۔

لیکن سیالکوٹ والے ہنستے رہے تھے۔

"اس رات بھی سائرن تو ہوا تھا۔ لیکن ہوائی جہاز شہر کے اوپر یوں چکر کاٹتا رہا جیسے وہ نشانہ لگانے کے لئے اپنی پسند کی جگہ کا انتخاب کر رہا ہو۔ .... چند لمحوں بعد سارا شہر ہل گیا اور دیر تک در و دیوار سے گڑگڑاہٹ کی آواز آتی رہی۔ میں گھر کی سیڑھیوں تلے کھڑا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں ہیروشیما میں ہوں اور میرے ایٹمی ذرات فضا میں تحلیل ہو چکے ہیں اور میں زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو چکا ہوں۔ وہ ایک لمحہ تھا۔ اس میں

پوری زندگی تھی۔ اس میں ازل تھی اور ابد تھی۔ میں نے موت کے بعد کی زندگی کو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ دوست! انسان مرتا نہیں۔ کبھی نہیں مرتا۔ بس لمحہ اپنی جون بدل لیتا ہے۔ چلو گھر چلیں۔"

چائے کی پیالی سے چٹاگانگ اور سلہٹ کی مٹی کی خوشبو آئی حالانکہ وہ سیالکوٹ میں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔

قرب اور فاصلے بھی تو محض تخیل کا ایک کرشمہ ہیں۔

جوشن کلاں

جوشن کلاں سیالکوٹ شہر سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس میں خوشبودار دھان اگتا ہے۔ ایکھ کے گنّے کھیتوں سے رس کی خوشبو آتی ہے۔ کپاس کے کھیتوں میں رنگ برنگ پھول کھلتے ہیں تو زمین کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ اس گاؤں کے پاس سے جو سڑک گزرتی ہے، اس کے دورویہ شیشم کے بڑے بڑے درخت ہیں جن کے سائے تلے مسافر آرام کرتے ہیں۔

"اس کو جانتے ہو؟" اس کے دوست نے پوچھا۔

"کسے؟" وہ اس اچانک سوال پر حیران رہ گیا۔

"اللہ بخش کو۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ جو راولپنڈی میں ہمیں ملا تھا۔"

"کب؟...... مجھے تو یاد نہیں آ رہا۔"

"اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ لمبا تڑنگا جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔"

"کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"اس نے ابھی ابھی رنگروٹی پاس کی تھی۔ وہ بڑا خوش تھا۔"

"خیر...... پھر؟"

"وہ میرے گاؤں جوشن کلاں کے ایک کسان کا بیٹا تھا۔" اس نے دوست سے کہا۔

ماتا روٹی دو

جوشن کلاں ابھی اندھیرے کی لپیٹ میں نہیں آیا تھا کیونکہ ابھی تک چاند چمک رہا تھا اور ہلکی ہلکی چاندنی چارسُو بکھری ہوئی تھی۔ لوگ چھت پر سوئے ہوئے تھے، وہ چھت پر مصلّٰے بچھائے بیٹھی تھی کیونکہ وہ رات کو بہت کم سوتی تھی۔ اسے پیاس لگی تو وہ نیچے صحن میں آئی۔ گاؤں خاموش تھا۔ اتنا خاموش اور پرسکون کہ کسی طوفان کی خبر ہوا کے ہلکورے پر سرگوشی بن کر آتی تو ماننے کو جی نہ چاہتا۔ صحن میں مکان کا سایہ تھا اور چاندنی کا ہلکا سا اجالا اور نیچی چاردیواری کے باہر اُسے پرچھائیں سی نظر آئی...... دیوار سے پرے ہلکا سا سایہ تو وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہو کر کہا "میرا وہم ہے وہم۔ میں بوڑھی ہوں۔ میری آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔" پھر بھی اس نے پوچھ لیا "تم کون ہو؟"

"میں ہوں"۔ آواز کانپ رہی تھی۔

وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔ یہ آواز مانوس بھی تھی اور نامانوس بھی پر اس میں کپکپاہٹ کیوں تھی؟"

"کون ہو تم؟" اس نے پھر پوچھا۔

"ماتا! میں تیرا بیٹا ہوں"

"تم اللہ بخش ہو؟"

"ماتا روٹی دو۔"

"پھر تم کون ہو؟"

"ماتا! میں جو کچھ بھی ہوں تم چنتا نہ کرو۔ اپنے ایک بیٹے کو روٹی دو۔ اُسے بھوک لگ رہی ہے۔"

اس کے لفظوں میں کتنا خلوص تھا۔

"ماتا..... ماتا....." پر وہ ڈر گئی تھی۔

اُس نے کہا "ذرا ٹھہرو! تم اللہ بخش نہیں تو نہ سہی تم نے مجھے ماتا کہا۔ میں تمہیں روٹی لا کر دیتی ہوں"۔ وہ کچے کوٹھے میں گئی۔ اس نے روٹیوں کی چنگیر اٹھائی اور ہنڈیا کی ساری دال ایک بڑے سے کٹورے میں انڈیل دی۔ پھر اس نے چنگیر دیوار پر رکھ کر کہا "لو کھاؤ بیٹا"۔

"ماتا!" گلوگیر آواز نے کہا "گاؤں چھوڑ کر نکل جاؤ۔ پورب کے رستے نکلنا"۔

"اس نے اپنی بہو کو جگایا اور وہ بچوں کو لے کر گھر سے نکلیں تو سارا گاؤں ان

کے ساتھ تھا۔ لوگ چل رہے تھے ان کے پاؤں کی چاپ بھی نہیں آ رہی تھی۔ گھٹے گھٹے سانس. گاؤں خالی ہو رہا تھا اور چاند ڈوب رہا تھا۔ اب کوئی پرچھائیں نظر نہ آ رہی تھی۔ پرچھائیاں تو اندھیرے اور اجالے کے سنگم پر جنم لیتی ہیں۔

"وہ اللہ بخش کی ماں تھی جو فوجی تھا۔ اس نے ماتا کہہ کر اسے پکارا کیونکہ وہ بھوکا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ اللہ بخش نہیں، یہ کرپا سنگھ ہے پر وہ ماں تھی۔ ایک بیٹے کی پکار پر اسے روٹی سے محروم نہ رکھ سکی۔" اس کے دوست نے کہا اور کہتے کہتے ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ تب اس کی طرف تکتے ہوئے اس نے سلسلۂ کلام کو یوں ختم کیا "لوگ کہتے ہیں وہ کوئی فرشتہ تھا جس نے گاؤں کو خطرے سے خبردار کر دیا۔"

"لیکن فرشتے کھانا نہیں مانگتے۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

راکٹ لانچر

اس کے کندھے پر راکٹ لانچر تھا۔ اس کی کمر سے تین راکٹ بندھے تھے ابھی ابھی یہاں ٹینکوں کی خوفناک لڑائی ہوئی تھی۔ وہ مورچہ بند ہو کر بھی نہ لڑ سکے تھے۔ وہ ایک راکٹ بھی نہ چلا سکا تھا۔ کیونکہ یہ جنگ کسی جنگی اصول کے مطابق نہ لڑی گئی تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اپنا ٹینک کون سا ہے اور بیگانہ کون سا اب وہ حیران تھا کہ اس کے ساتھی کہاں گئے۔ کیونکہ چار سُو دھواں چھایا ہوا تھا اور غبار اُمڈ رہا تھا۔ دمن دھن گولے برس رہے تھے اور دھرتی کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ درخت سرنگوں ہو گئے تھے۔ دھرتی پس کر مہین دھول بن کر رہ گئی تھی

اُسے کیا خبر کہ کل کو تاریخ میں ٹینکوں کی اس لڑائی کو کیا درجہ ملنے والا ہے۔ اسے تو معلوم تھا کہ آج اس کے پاس تین ٹینک توڑ راکٹ تھے اور ابھی تک اس نے ایک راکٹ بھی نہیں چلایا تھا۔

اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

اس کی آنکھوں میں مہین دھول گھس گئی تھی۔ اس میں بارود کی بُو تھی، چبھن اور تلخی تھی۔

"چاچا اللہ بخش "

یہ کس کی آواز تھی؟ اس نے گھوم پھر کر آواز کو پکڑنے کی کوشش کی۔

"چاچا اللہ بخش "

"تم کون ہو؟ تمہاری آواز مانوس ہے لیکن یہ نجانے کس دنیا سے آ رہی ہے"

"چاچا!"

"تم نور خاں ہو!"

"چاچا!"

"نور خاں! تم شرارت سے باز نہیں آؤ گے۔ سامنے آؤ۔ دیکھو تو سہی میں اکیلا ہوں!"

نور خاں اس کی پلٹن کا کم عمر سپاہی تھا۔ بڑا شریر اور چلبلا۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ پینتیس برس کی عمر بس ساری پلٹن کا چاچا تھا کیونکہ اس کے ہم عمر ساتھی لانس نائک نائک اور حوالدار بن چکے تھے اور وہ سپاہی کا سپاہی رہا تھا۔

"اللہ بخش تم ساری عمر گھامڑ کے گھامڑ رہے"

"نہیں صاحب۔ یس سر..... نو سر....."

"میں گھامڑ سپاہی ہوں۔ اٹھارہ سال کے بعد بھی گھامڑ ہوں۔ اب تو میری مونچھوں میں سفید بال بھی آ گئے ہیں۔ صاحب! میں گھامڑ نہیں ہوں"

"اللہ بخش! اونٹ کے مافق مارچ نہ کرو"

"میں لمبا ہوں، میں اونٹ کے مافق مارچ کرتا ہوں۔ میرے گھٹنے سیدھے نہیں رہتے پَر میں نے تیس تیس میل روٹ مارچ کی اور میں نے تھکنے کا نام نہ لیا"

راکٹ لانچر کو سیدھا رکھو۔ راکٹ ٹھیک طرح سے ڈالو۔ نشانہ سیدھا لگاؤ۔ شاباش جوان!"

"اللہ بخش! تم جیسا سپاہی تو تیر کمان سے لڑنے کے قابل ہے۔ ادھر اب نیا اسلحہ آ گیا ہے۔ جنگ کا طریقہ بدل گیا ہے۔ تم کیسے سیکھے گا؟ تُو تو گھامڑ کا گھامڑ رہے گا"

گھامڑ سپاہی!

کل کے چھوکروں کے کندھوں پہ تین تین بتیاں لگ گئیں اور وہ ابھی سپاہی تھا۔

گھامڑ سپاہی!

"چاچا!"

"آیا نور خاں"

"آج میں نے تمہیں شیر کی طرح لڑتے دیکھا۔ تم توپ کے منہ میں کود جاتا

چاہتے تھے اور تم زخمی تھے۔ میں نے بوتل سے پانی کے چند قطرے تمہارے منہ میں ٹپکائے تھے اور تم نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ تم نے پوچھا تھا "چاچا! میں کہاں ہوں؟"

"جنگ کے میدان میں۔" میں نے کہا تھا اور تمہارے ہونٹ مسکرائے تھے تم نے کچھ کہنا چاہا لیکن نہ کہہ سکے۔

"نور خاں! اب تم کہاں ہو؟ مجھے کہاں سے بلا رہے ہو؟"

"چاچا!"

"ہاں! ہاں! میرے پاس تین راکٹ ہیں۔ میں اپنی پلٹن سے بچھڑ گیا ہوں اور مجھے راستہ نہیں مل رہا۔ تم!...تم کہاں ہو؟.... اتنے فاصلے پر! تم غبار پر اڑ رہے ہو اور تم بہت دور ہو پر میں نے بھی تیس تیس میل روٹ مارچ کی ہے میں آیا نور خاں میں آیا۔"

غبار کائی کی طرح پھٹ گیا۔ نیل کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ نور خاں دوسرے کنارے پر تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ نور خاں پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بڑھتا رہا۔ نور خاں ہٹتا رہا۔

"تم ٹینک کے پیچھے کیوں چھپ گئے نور خاں؟"

"راکٹ ڈالو۔ راکٹ لانچر کو سیدھا رکھو۔ ٹھیک نشانہ لو۔ شاباش جوان!"

دھن.... ٹینک میں ایک شعلہ سا گھس گیا..... اور پھر دنیا تہہ وبالا ہو گئی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔

"چاچا!"

"نور خاں! تم!"

غبار پھر کائی کی طرح پھٹا۔ وہ آگے بڑھا تو نور خاں پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ ایک ٹینک کے پیچھے چھپ گیا۔

"راکٹ ڈالو، راکٹ لانچر کو سیدھا رکھو۔ ٹھیک نشانہ لو۔ شاباش جوان!"

دھن...... ٹینک میں ایک شعلہ سانپ کی طرح بل کھا کر گھس گیا...... اور اس کے جسم پر بچھو ڈنک لگانے لگے۔

"چاچا!"

"دیکھو تو نور خاں! اب میں چل کر نہیں آسکتا۔"

"چاچا!"

"دیکھو تو نور خاں! اب میں چل کر نہیں آسکتا۔"

"چاچا!...... چاچا!...... چاچا!"

"تم بہت دور ہو نور خاں۔ مجھ سے اب چلا نہیں جاتا پر میں آؤں گا۔ مجھے بلاتے رہو۔"

وہ پھر چل پڑا۔ نور خاں تیسرے ٹینک کے پیچھے ہوا میں معلق تھا۔ اس نے تیسری بار راکٹ چلایا اور ٹینک سے شعلے لپکے۔

تین راکٹ...... تین ٹینک۔

اس نے راکٹ لانچر پھینک دیا۔

نور خاں غبار کے بادل میں گم ہو گیا۔

"تم چلے گئے نور خاں۔ میں اب کہاں جاؤں۔"

اس کے چاروں طرف خلا تھے اور وہ زمین پر رینگ رہا تھا۔
وہ گھامڑ سپاہی جس کے راکٹ پہلی بار نشانے پر لگے تھے۔
"چاچا!" اس نے آنکھیں کھول دیں۔
"میں کہاں ہوں؟"
"اپنے مورچے میں۔"
"اللہ بخش! تمہارا راکٹ لانچر کہاں ہے؟"
"حوالدار صاحب! تینوں راکٹ نشانے پر بیٹھے۔"
"راکٹ لانچر؟"
"وہ میں نے پھینک دیا صاحب۔"
"تم گھامڑ کے گھامڑ رہے۔ وہ تو بہت قیمتی ہتھیار ہے۔"
وہ لڑکھڑا کر اٹھا۔
"ٹھہرو۔"
اس کی زخمی ٹانگوں نے اس کے ارادے پر لبیک کہا۔ وہ دوڑا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ زمین پر رینگ رہا تھا۔ لیکن راکٹ لانچر اس کے کندھے پر بندھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی اور موت کی کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

وہ جب ہسپتال میں پہنچا تو بے ہوش تھا۔
جب اسے ذرا ہوش آیا تو اس نے پوچھا "راکٹ لانچر؟"
"وہ محفوظ ہے اللہ بخش۔" ڈاکٹر نے کہا جو سارے قصے سے واقف تھا۔

اللہ بخش نے زیرلب مسکرا کر کہا "سر! اب تو میں گھامڑ سپاہی نہیں"۔

"میں حیران ہوں اتنا زخمی ہونے کے باوجود اسے اپنے مورچے تک کون سی طاقت کھینچ لائی؟"

اس نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"سبز پوش۔" اس کے دوست نے کہا۔

"سبز پوش!" وہ حیران ہو گیا تھا۔

"اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" اس کے دوست نے کہا۔

"یہی کہ معجزات کا زمانہ گزر چکا ہے"

"ایک لطیفہ سنو۔"

"سناؤ۔"

"ٹینکوں کی خوفناک لڑائی کے بعد ایک بڑے فوجی افسر نے چونڈہ کے محاذ پر لڑنے والے ایک سپاہی سے کہا جوان! قوم تمہاری بڑی ممنون ہے۔ تم نے اس کی عزت بچالی۔"

"صاحب! یہ سب اللہ کا فضل ہے۔ اس نے ہماری مدد کی،

"نہیں صاحب! اللہ نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ پاس کھڑے کمپنی کمانڈر نے کہا۔ سارے سپاہی کانپ گئے۔ یہ تو کفر کا کلمہ ہے۔

"سر!" ہر سپاہی کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"دیکھو جوان! اللہ تو ہر محاذ پر خود لڑتا رہا ہے۔ البتہ ہم نے اس کی مدد کی

سبز پوش

"سبز پوش ...... سبز پوش ....." اس قوم کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ معجزات کا دور نہیں۔ اب تو سائنس کی حکمرانی ہے۔ ایٹم کی اس دنیا میں سبز پوش!
"اللہ کی فوجیں تمہاری مدد کر رہی تھیں لیکن تم انہیں دیکھتے نہیں تھے۔"
اور اب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہر محاذ پر قید ہونے والے دشمن کے سپاہیوں نے پہلی بات یہی پوچھی تھی "تم تو تھوڑے سے آدمی ہو۔ تمہاری سبز پوش سینا کہاں گئی؟" سبز پوش سینا ..... بس میں بیٹھو تو ان کا تذکرہ۔ کسی چوک پر کھڑے ہو جاؤ تو ان کا ذکر۔ اِن باتوں سے ایمان کمزور ہوتا ہے۔ اپنے دست و بازو پر بھروسہ نہیں رہتا۔ اس کا دوست بھی اسی وہم میں مبتلا تھا اور وہ بوڑھا بھی جو اسے پل پر ملا تھا اور جس کی بیوی نے ڈوگرائی کی مسجد کے مینار سے سنا تھا "لوگو! گاؤں چھوڑ جاؤ" یہ آواز گلبرگ میں کیوں نہ پہنچی کہ لوگو! گلبرگ محفوظ ہے۔ لاہور چھوڑ کر نہ جاؤ ورنہ وہ تختۂ گلاب کی ملکہ اتنی خائف نظر نہ آتی اور یہ نور اللہ بخش شہید کا جوش ایمان تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود وہ راکٹ لانچر لے کر مورچے میں پہنچ گیا۔

سبز پوش .... سبز پوش .....

عجیب عجیب باتیں۔ ایمان کی کمزوری۔ میں ان پر کیسے یقین کر لوں۔ جوش ایمان اپنی جگہ پر لیکن عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

میں عقل کا غلام بھی نہیں ..... لیکن میری پیشانی پر پسینہ کیوں ہے اور میرا رواں رواں کانپ رہا ہے ؛ اس لئے کہ پل اڑ گیا ہے اور میں اپنی دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔ پل کے اس پار میرا گھر ہے جہاں میرے بچے سیڑھیوں تلے دبکے ٹھٹھرے ہیں۔

اُس دن وہ پل پر سے گزرنا چاہتا تھا کہ ٹریفک رک گئی۔

"داتا کی نگری پر دشمن کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔" ایک خوش پوش سکوٹر سوار نے کہا۔

"لیکن دشمن بم تو گرا سکتا ہے۔" اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

"تمہارا ایمان کمزور ہے۔ جانتے ہو پل پر کتنی بار حملہ ہوا؟"

"نہیں تو....."

"دو بار۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"دونوں بار لوگوں نے دیکھا کہ جہاز نے بم گرایا۔"

"یہ نظر کا دھوکا ہو گا۔ ہمارے محکمۂ اطلاعات نے ایک بار بھی اس کی تصدیق نہیں کی۔"

"بم ہوا میں غائب ہو کر رہ گیا۔ وہ دریا میں بھی گرتا ہوا نظر نہ آیا۔"

"سب کچھ ضعیف الاعتقادی کا کرشمہ ہے۔ اوّل تو پل پر کبھی حملہ نہیں ہوا۔ اگر ہوا بھی تو نشانہ ٹھیک نہ پڑا ہو گا یا جہاز بم نہ گرا سکا ہو گا۔ ارے بھائی! چھوڑو ان قصوں کو۔ جنگ کے ایام میں انسان کا تخیل بہت تیز ہو جاتا ہے۔ وہ عجیب عجیب

کہانیاں تراشتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ لوگوں نے ایک سبز پوش کو دیکھا کہ جھولی پھیلائے دریا کے پانی میں کھڑا ہے۔"

"سبز پوش!" دوسرا آدمی کھلکھلا کر ہنس پڑا "سبز پوش، وہم کا کرشمہ، تخیل کی کرامت ایمان کی کمزوری۔ چلو ٹریفک کھل گئی۔"

اور آج تو واقعی پل اڑ گیا ہے۔

آج وہ سبز پوش کہاں گئے جو بم کو جھولی میں لے لیا کرتے تھے۔

ایک بار پل ٹوٹ جائے تو شاید کوئی سبز پوش اس خلا کو پر نہیں کر سکتے۔

اس کے سارے جسم پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے رینگنے لگے اور پیٹ کے بل لیٹے لیٹے اس کی ٹانگیں سرد اور بے حس ہو گئیں اور ذہن مر گئی۔ سایوں میں موت کی خنکی سما گئی موت جو زندگی کی دھوپ سے پرچھائیں بن کر لپکی ہے مایوسی کی موت نا امیدی کی موت۔ وہ جسم سے عاری ہو گیا۔ کیونکہ جسم اور روح کو ملانے والا پل اڑ چکا تھا پھر بھی سوچ کا سرچشمہ جاری تھا۔ اس کا منبع کیا تھا؟ کیا اس کا ذہن زندہ ہے؟ جسم کے ساتھ روح کیوں نہ مر گئی۔ شاید میرے ایمان کا پل تباہ ہو گیا ہے۔ ایمان جس نے زندگی اور موت کے رشتوں کو ملا رکھا تھا۔ اب وہ خوف زدہ تھا۔ بے انتہا خوف زدہ۔ خوف موت ہی کا ایک رُخ ہے۔ لیکن نہایت بھیانک رُخ۔

تب کسی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک ارتعاش ۔ ۔ ۔ ۔ ایک لہر ۔ ۔ ایک ننھی سی لرزش ۔ ۔ ۔ ۔ کپکپی ۔ ۔ ۔ ۔ میرا

تخیل کتنا حساس ہے ...... تم کون ہو؟ ...... میں تو مرچکا ہوں ...... میری پیشانی پر نرم نرم انگلیوں کی لمزش جیسے کوئی جسم اور روح کے تار ملا رہا ہو ...... روح کے دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دے رہا ہو ...... اٹھو تم صورِ اسرافیل کی آواز نہیں سن رہے ...... تم نے دم لے لیا ہے۔ اب آگے چلو۔ یہ تو لاانتہائی سفر کا نقطۂ آغاز ہے جہاں تم ٹھہر گئے ہو ...... اٹھو! ...... اٹھو! ...

"تم کون ہو؟"

"سبز پوش"

اُس کی روح چونک کر جسم میں حلول کر گئی۔ جسم تھرتھرایا جیسے کوئی برقی رو اس میں سے گزر گئی ہو۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آنکھیں مَل مَل کر دیکھا وہ کون تھا جس نے اسے موت کی نیند سے جگایا۔

"اِدھر دیکھو"

اُس نے پُل کی طرف دیکھا۔ جہاں پہلے پل تھا، وہاں ابھی تک خلا تھا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں"

"اِدھر دیکھو ...."

وہ خلا میں معلق تھا۔ ایک سبز پوش۔ اس کی پیشانی کے گرد نور کا ہالہ تھا۔ اس نے انگلی کا اشارہ کیا۔ ایک کرن پھوٹی اور دونوں طرف سے پل لپکتا ہوا آیا اور کھٹ سے اُس کے دونوں سرے مل گئے۔

صورِ اسرافیل گونجا۔ "زندگی کے دونوں سرے مل گئے ہیں۔ اب زندگی کی شاہراہ پر آ جاؤ۔"

سبز پوش اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"جو لوگ زندگی سے بھاگتے ہیں، ان کے پل ٹوٹ جاتے ہیں" اس نے کہا۔

اس نے سبز پوش کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور شرما کر رہ گیا۔

اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھ لی تھی۔

وہ خود سبز پوش تھا اور اس کی پیشانی سے نور پھوٹ رہا تھا

اور پھر سے زندگی کی شاہراہ پر بے خوف کھڑا تھا۔

(۱۹ اپریل ۶۶ء)

اے
وادیٔ
لولاب
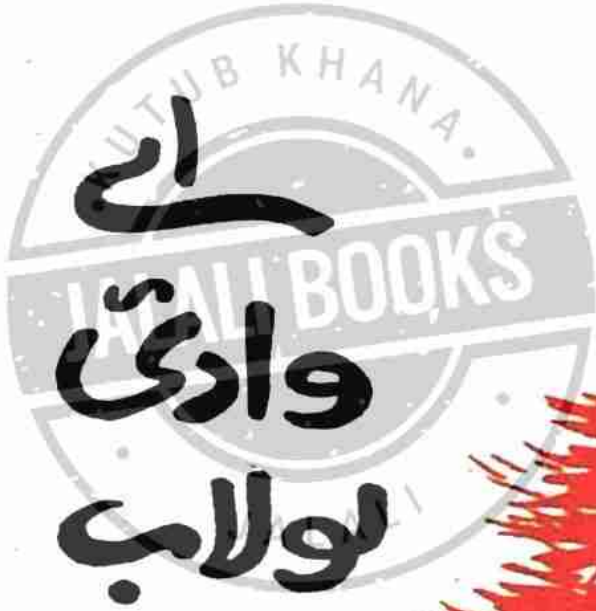
اے وادئ لولاب

وہ ایک جھیل کے کنارے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا!
اُس کے رخساروں پر گلاب کی دہکتی ہوئی سرخی تھی۔ اس کی ناک ستواں تھی اور چہرہ کتابی۔ اس کی آنکھوں میں اس جھیل کے پانی کا عکس تھا۔ جس کے کنارے وہ کھڑا تھا اور اس کی پیشانی پر ذہانت اور فراست کا چاند چمک رہا تھا۔ اس کے جذبات کی آگ میں ان پھولوں کی نزاکت تھی جو جھیل کے کنارے لہرا رہے تھے اور اس کے سیب کی شیرینی اور خوبانی کا گداز تھا۔ اس کے ارادوں میں پہاڑوں کی عظمت تھی اور دور نظر آنے والی فلک شگاف نیلم کی دیواروں نے اسے تخیل کی رفعت عطا کی تھی۔

وہ وادی لولاب کا شاعر تھا:

اس وادی میں ہرے بھرے میدان تھے اور ان میں چنار کے درخت اور جنت الفردوس کے ثمر بار اشجار کے باغات تھے اور باغات میں چشمے تھے اور چشموں سے آبِ حیات

کی نہریں جاری تھیں۔ ان کا پانی تڑپتا ہوا سیماب تھا اور اس وادی کی فضاؤں میں مرغانِ سحر بے تاب تھے۔

وہ جس جھیل کے کنارے کھڑا تھا، اس کا پانی نیلا تھا اور نیلاہٹ میں آسمان کا عکس بھی گھل مل گیا تھا۔ اس کے کنارے زعفران کے پھول کھل رہے تھے اور اس کی ہلکی ہلکی لہروں میں کوثر و سلسبیل کی جھنکار تھی اور ان پر بجرے تیر رہے تھے اور ہر لہر میں سینکڑوں سورج چمک رہے تھے۔ دور نیلم کی دیواروں پر چاندی کے کلس تھے جو سفید بادلوں کو چھو رہے تھے اور بادلوں سے زندگی کا نور چھن رہا تھا۔ زندگی جو دھان کا سرسبز کھیت، ناشپاتی کا سفید پھول اور سیب کی سرخ قاش تھی۔

اس جھیل کے کنارے پر ایک شہر آباد تھا۔ پھولوں اور خوشبوؤں کا شہر۔ حنا بستہ دلہنوں کا شہر۔ یہ شہر خود بھی تو ایک دلہن تھا جس کے جوڑے میں سدابہار پھول گندھے ہوئے تھے۔ اور اس کی مانگ میں تاروں کی افشاں تھی، کہکشاں کی نقرئی دھول اور جھیل کے شفاف پانی کا تقدس تھا۔ یہ شہر سنہری دھوپ میں نہا رہا تھا۔ اس کی مسجدوں کے کنگرے آسمان کو چھو رہے تھے۔

شاعر نے حسین وادی کے گیت گائے تھے، اس کے برف پوش پہاڑوں کی عظیم چوٹیوں کی رفعتوں کے ترانے لکھے تھے، اس کی گنگناتی ہوئی ندیوں کی لے پر نغموں کا ساز بجایا تھا۔ اس نے ان آہو چشم غزالانِ لولاب کی تعریف میں شعر لکھے تھے، جو اس وادی میں عام تھے۔ اس وادی کے چپے چپے پر استعاروں اور تشبیہوں کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں سنبل و بنفشہ کے کاکل پریشاں تھے اور کہیں سنبل و بنفشہ کہیں نسرین و نسترن کے معطر سانس، کہیں لالے کے دل کے داغ تھے اور کہیں شفق کے زعفران زار

کہیں چنار کی آگ تھی اور کہیں سرو و شمشاد کے راست قد ترکانِ شیراز پرے باندھ کر ایستادہ تھے۔ اس وادی کے آبشار پرستان کے نغمے گاتے تھے اور اس کا ایک ایک پرند بلبل ہزار داستان تھا۔ اس لئے اس شاعر کی غزل مرصع تھی اور اس کا قصیدہ ہمالہ کی شان و شوکت کا حامل تھا۔

اس شاعر کا نام نور زمان تھا۔

یہ اس وادی کے سب سے بڑے کالج کا طالب علم تھا۔ اس کا باپ علی جو ایک نجیب و چرب دست و تر دماغ دست کار تھا جس کے ہاتھ شال دوشالوں پر زری کے پھول بوٹوں کی تخلیق کرتے تھے۔ وہ ایک کھاتا پیتا کاریگر تھا جس کی دکان شہر میں تھی اور مکان اس کی نواحی بستی تسنیل گاہ میں تھا۔ وہ نور زماں کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتا۔ اسے نور زماں کی شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نور زماں کی سوچ میں ڈوبی ہوئی جوانی دیکھ کر اسے دکھ ہوتا تھا۔

اس نے ایک دن پوچھا۔ "نور زماں، تم جوان ہو اور جوانی میں لوگ اتنے خاموش نہیں ہوتے۔ تم کیا سوچتے رہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں ابا جان، میں سوچ بھی کیا سکتا ہوں؟"

"پھر تم ہنستے کھیلتے کیوں نہیں؟"

"اس لئے کہ میری سوچ پر پہرے ہیں۔"

"کون سے پہرے؟"

"صدیوں کی غلامی کے پہرے!"

"صدیوں کی غلامی؟" علی جو نے گھبرا کر کہا۔

"میری سوچ کے سرچشمے بند ہیں، میں کچھ بھی تو نہیں سوچ سکتا" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"نور زماں، میری طرف دیکھو"

علی جُو نے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ان آنکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک طوفانی لہر بے تاب تھی۔ وہ لرز گیا۔ اس نے زیرِ لب کہا "حسن جُو!"

"میں تو نور زماں ہوں ابا" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تمہارے چچا حسن جُو کی آنکھ میں بھی میں نے یہی کرب دیکھا تھا بیٹا۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے میں نے اسے اس طوفان سے بروقت خبردار کر دیا تھا، لیکن وہ نہ مانا اور اپنی ہی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا" علی جُو نے کہا اور اس کی آواز گلوگیر ہو گئی "میں نے بڑی مصیبتوں سے اس راکھ پر اپنی نئی دنیا تعمیر کی تھی بیٹا! اب تم میری دنیا کو تہہ و بالا کرنے پر کیوں تل گئے ہو؟ میں بہت دکھی ہوں"

علی جُو نے رک کر بیٹے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پھر بڑی لجاجت سے کہا "مجھ پر رحم کرو گے بیٹا؟"

نور زماں نے کانپ کر منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھ میں ایک تارہ چمکا اور چمک کر بجھ گیا اس نے دور افق پر نگاہیں جما دیں۔ اس نے سوچا "اٹھارہ سال سے شفق کی یہ سُرخیاں بجھی بجھی سی کیوں ہیں؟ کوئی دوسرا حسن جُو کیوں پیدا نہیں ہوا؟"

علی جُو نے آہستہ آہستہ اس کے کندھوں سے ہاتھ اٹھا لئے اور ہو لے ہو لے آنگن کو عبور کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نور زماں اپنے آپ میں گم افق پر نظریں جمائے اپنے آنگن میں کھڑا رہا۔

"شاعر اعظم، آج اتنے خاموش کیوں ہیں؟"
میٹھی آواز کا ایک جھرنا پھوٹا اور ترنم کے ٹھنڈے چھینٹوں نے اسے خواب گراں سے بیدار کر دیا۔
"شاعر اعظم نہیں تو......"
"کوئی نئی غزل نازل ہو رہی ہے؟"
"نہیں تو......"
"ماہنامہ حریت میں ایک غزل کسی نور زماں نور لولابی کی، نظر سے گزری، بڑی میٹھی غزل ہے۔ سوئی سوئی سی گم سم غزل، پر میں نے اس میں ایک چنگاری بھی دیکھی۔ صرف ایک جھلک...... مجھے تو خطرہ ہے کہیں وادی میں آگ نہ لگ جائے" پرسکون لہجے کی گہرائی میں نور زماں نے خوف کی ایک لہر کا ہلکا سا نغمۂ ارتعاش بھی سن لیا۔
"برف میں آگ نہیں ہوتی زینت" اس نے مسکرا کر کہا۔
"ابھی ابھی سورج ڈوب رہا تھا اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، تو یوں لگا جیسے پہاڑوں کی چوٹیاں شعلوں کی لپیٹ میں آچکی ہیں"
"وہ ٹھنڈی آگ تھی، یہ آگ جلا کر بھسم نہیں کرتی"
"تم کس آگ کی تلاش کر رہے ہو نور زمان؟" زینت نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"چناروں کی آگ، زعفران کے شعلے، گلاب کی دہکتی ہوئی سرخیاں۔"
"تو پھر میں سچ کہہ رہی تھی نا۔ تم ضرور کوئی نئی غزل کہنے والے ہو" زینت نے مسکرا کر کہا۔
نور زمان، زینت کی اس پُر اسرار مسکراہٹ کا محرم راز تھا۔ یہ دلنواز مسکراہٹ

روح کی گہرائیوں میں بھی اتر جاتی تھی۔ اس میں زینت کے وجود کا بید لرزاں کی طرح لچکتا ہوا اضطراب بھی تھا اور اس میں شمشاد کی راستی اور چنار کی آگ بھی تھی۔

"دیکھو نور زماں، اتنا مت سوچو" اس لہجے میں وہ زینت بول رہی تھی جو اس کے چچا کی بیٹی تھی، جو شہر کے ایک کالج میں پڑھتی تھی اور بہت ذہین تھی اور جو اس کے ساتھ بچپن سے منسوب تھی اور اس کی ہمدرد اور دمساز تھی۔

تب آنگن میں لگے ہوئے ان کے ہم عمر ناشپاتی اور خوبانی کے دو پیڑوں پر شام اتر آئی اور خنکی کی ایک لہر زینت کی آواز میں بولی۔

"چلو نور زماں اندر چلو، باہر سردی ہو رہی ہے"

وہ جھیل کے کنارے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا۔

زینت نے نقاب کی اوٹ میں سے پوچھا "وادیٔ لولاب کا بیٹا خاموش کیوں کھڑا ہے؟"

"جھیل کا پانی کتنا پرسکون ہے زینت، لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اس کا خضر ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اس میں طوفان کیوں نہیں اٹھتا؟"

زینت خاموش رہی، تو وہ بولا: "زینت، چناروں کی آگ سرد کیوں ہے؟ ہمالہ کی برف میں اگنی کنڈ کیوں نہیں جلتا؟"

"اس لئے کہ نور زماں نور لولابی اب تک وادیٔ لولاب کے حسین نغمے گاتا رہا اس نے وادی کی آہو چشم بیٹیوں کے ملکوتی حسن کے قصیدے پڑھے، لیکن اس کے دل کا جوالا مکھی سویا رہا۔ یہ آتش فشاں پھٹے گا۔ تو وادی میں آگ لگ جائے گی"

نور زماں نور لولابی حیران ہو گیا۔

کیا یہ وہی زینت تھی جو کل حریت میں چھپنے والی ایک غزل کی راکھ میں ٹھنڈی چنگاری کی چمک دیکھ کر گھبرا گئی تھی؟

اس نے سوچا اور منہ پھیر کر ایک نظر وادی کے سب سے بڑے شہر کے در و دیوار پر ڈالی جہاں سنہری دھوپ سوئی ہوئی تھی اور مسجدوں کے مینار اونگھ رہے تھے۔ منبر و محراب پر موت کا سایہ لرز رہا تھا۔ اس نے دوسری نظر زینت پر ڈالی جو مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ کی سطح پرسکون تھا، لیکن تہہ میں اس کا ازلی و ابدی اضطراب جوالا مکھی بنا ہوا تھا اور نقاب کی اوٹ میں آگ مگ رہی تھی۔

وہ کانپ اٹھا۔

اس نے آنکھیں جھکا کر کہا: "زینت، جانتی ہو آج سے اٹھارہ سال قبل یہ آتش فشاں پہلے بھی پھٹا تھا؟"

"جانتی ہوں"۔

"اس راکھ کو نہ کریدو، کوئی چنگاری زندہ نکل آئی، تو کیا ہوگا؟"

"میں جانتی ہوں جو کچھ ہوگا"۔

"چچا حسن جو!"

"میں جانتی ہوں، وہ اس آگ میں جل کر امر ہو گئے تھے نور زمان"۔

"تم انہیں دیکھ بھی نہ سکیں۔ میں محض ان کے دھندلے سے سائے کا تصور کر سکتا ہوں"۔

نقاب کے اندر اس نے جھرنے کو پھوٹتے ہوئے نہ دیکھا۔ "ہاں، میں ان کے

دھندلے سے سائے کے تصور سے بھی محروم ہوں نور زماں، لیکن ان کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ میں نے اکثر اپنی روح کی گہرائیوں سے ان کی آواز سنی ہے۔" زینت، تم نے میرے گوشت پوست سے جنم لیا، میرا ولولہ، میرا جذبہ، میرا شوق تمہیں وراثت میں ملا ہے۔ سرور اکھ پر میرا ساز مدتوں سے خاموش پڑا ہے اور کسی نغمہ بار ہاتھ کا انتظار کر رہا ہے۔"

"لیکن تم ایک عورت ہو۔"

"ہاں، میں ایک کمزور عورت ہوں۔ تم آگے بڑھو نور لولابی اور اس ساز کو اٹھا لو۔ نغمہ مدتوں سے خاموش ہے تم آگے نہیں بڑھو گے، تو....."

"تو؟" اس نے پوچھا۔

"اس ساز کو میں اٹھا لوں گی۔"

"نہیں"...... اس نے تڑپ کر کہا۔

اور پھر وادیٔ لولاب کی بیٹی اس کے پاس سے خوشبو کا ایک جھونکا بن کر گزر گئی۔

وہ دیر تک جھیل کے کنارے سر جھکا کر سوچتا رہا۔

پھر خوشبو کی تال پر کوئی مغنی دھیمے لہجے میں بول اٹھا ؎

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغان سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب

اے وادیٔ لولاب

وہ چونک گیا۔ یہ نغمہ گرم گرم خوشبو کی لہر بن کر کہاں سے پھوٹا؟

یہ ڈھیلا تار کیوں چھنک گیا؟
اُس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مضراب

اے وادی لولاب!
یہ ساز تو مدتوں سے خاموش تھا۔ یہ تو کسی نغمہ بار ہاتھ کا انتظار کر رہا تھا۔
"میں یہ ساز اٹھا لوں؟"
"نہیں ...."
"میں چچا حسن جُو کی طرح جل کر راکھ ہو جاؤں؟"
"نہیں ......"
"پر میں اپنے من کی جوالا مکھی کا کیا کروں؟"
"جھیل کے برفاب میں کود جاؤ"
"نہیں ......"
"اس ساز کو بڑھ کر اٹھا لو، ورنہ کوئی اور ہاتھ تم سے پہلے بڑھ گیا، تو تم اس سعادت سے محروم ہو جاؤ گے"!

شہر کے در و دیوار پر شام کی راکھ بکھر چکی تھی۔ سرد اور بے جان راکھ۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے بڑھا۔ اس نے راکھ پر سے ساز اٹھایا، تار کسے اور مضراب کی ایک ٹھوکر لگی، تو نغمے کی آواز ل گئی۔ اس نے کتابیں جھیل میں پھینک دیں، کیونکہ وہ پہلے صرف کتاب خواں تھا، اب صاحب کتاب بن چکا تھا۔

وادیٔ لولاب چونک اٹھی۔ ایک برف پوش چوٹی پر آگ لگ گئی اور وادی جاگ اٹھی سے

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

"علی جُو ...... علی جُو ......" بہت سی آوازوں نے اسے مل کر پکارا "تمہارے گھر سے اس نغمے نے پھر جنم لے لیا ہے جس سے ہم خائف تھے"

"اس نغمے کا ابھی سے گلا گھونٹ دو علی جُو، ورنہ بستی میں آگ لگ جائے گی"

"علی جُو ...... علی جُو ...... تم باغی ہو۔ تمہارا گھر باغیوں کی پناہ گاہ ہے۔ ہم اس گھر کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیں گے"

"نہیں ......" علی جُو نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

"نور زمان ...... بیٹا نور زمان، دیکھو لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں اب مجبور ہوں، صورِ اسرافیل پھونکا جا چکا ہے اب قیامت بپا ہو کر رہے گی"

"بیٹا، تم نے یہ کیا کیا؟ ابھی حسن جُو کا داغ میرے سینے میں دہک رہا تھا کہ تم بھی اس آگ میں کود گئے؟"

"چناروں کی سوئی ہوئی آگ بھڑک اٹھی ہے۔
برف پوش چوٹیوں سے آگ کے چشمے پھوٹ نکلے ہیں۔
وادی کے خس و خاشاک شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے ہیں
شفق کے لالہ زار آتشِ نمرود کا دہکتا ہوا الاؤ بن چکے ہیں۔

ہم اپنے وقت کے ابراہیم ہیں۔
اِس آگ میں کود جائیں گے، تو انگارے پھول بن جائیں گے"

چار سو آگ لگ رہی تھی۔ بستی شعلوں کی لپیٹ میں آگئی تھی اور وہ جو وادی کا شاعر تھا اپنے نغموں کی آگ میں جل رہا تھا اور وہ آگ کے سمندر میں اپنا نغمہ گا رہا تھا۔ ققنس کی طرح جو خود اپنے آپ کو آگ لگا کر دیپک راگ گاتا ہے، کیونکہ اس سے نیا نغمہ جنم لیتا ہے۔

زینت سُنبل گاہ کی جلی ہوئی بستی کے ایک شکستہ مکان کی گرم گرم راکھ پر کھڑی تھی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان میں ایک آنسو بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ وادیٔ لولاب کی بیٹی تھی۔
اِس راکھ پر شاعر کا ساز پڑا تھا جسے آگ جلا نہ سکی تھی۔ اس نے ساز اٹھا لیا اور مضراب کی ایک ٹھوکر نے تار سے سرگوشی کی، تو نغمے کی راکھ سے نئے نغمے نے جنم لے لیا۔

"نغمہ مر نہیں سکتا
نغمہ قید نہیں ہو سکتا
نغمہ جل نہیں سکتا۔
آگ اِس کے لئے گلزارِ ابراہیمی بن جاتی ہے"

(اکتوبر ۱۹۶۷ء)

جلی
مٹی
کی
خوشبو

جلی مٹی کی خوشبو

پکی سڑک اگرچہ اس کے گاؤں تک تو نہیں جاتی تھی لیکن دس بارہ میل کا فاصلہ لاری پر طے ہوتا جاتا تھا اور کوس دو کوس پیدل چل لینا کون سا مشکل تھا۔ آج اسے سیالکوٹ سے بس نہیں ملی تھی کیونکہ جنگ کے بعد ابھی تک اس کا علاقہ آباد نہیں ہوا تھا اور آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔

وہ اللہ کا نام لے کر پیدل چل پڑا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ دھوپ میں نرمی بھی تھی اور حدت بھی۔ سردیوں میں ایک دو اچھی بارشیں بھی ہو گئی تھیں۔ سیالکوٹ سے نکلتے وقت اسے کھیتوں کا سماں بہت بھلا معلوم ہوا۔ ہریالی لہریں لے رہی تھی اور گندم کے پودے دھوپ میں نہا رہے تھے۔

جنگ سے لے کر اب تک وہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہا تھا۔ اس نے گندم کی بوائی میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ نم دار مٹی کی باس بھی

سونگھی تھی۔ یہ دھرتی بھی پرائی نہیں تھی پر اس مٹی کی خوشبو کچھ اور ہی تھی جس میں اس کا اپنا خون پسینہ ملا ہوا تھا۔ جب اس کو پتہ لگا تھا کہ اس کا علاقہ دشمن سے خالی ہو گیا ہے تو اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ اٹھی تھیں اور اس کے ہاتھ ہل کی ہتھی کو گرفت میں لینے کے لئے بے قرار ہو گئے تھے۔

پکی سڑک کے دونوں کناروں پر گھاس اگ آئی تھی اور درختوں پر شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ گھاس میں بے نام سی خوشبو تھی۔ اس نے خوش ہو کر سوچا "میرے کھیت گھاس سے اٹ گئے ہوں گے۔ گھاس کتنی بلچپال ہے۔ وہ دھرتی کا ننگ نہیں دیکھ سکتی پر جب ہم دھرتی کا سینہ اکھاڑتے ہیں۔ ۔ ۔" وہ سوچتے سوچتے رُک گیا "اب میں ہل کہاں سے لاؤں گا اور بیلوں کی جوڑی .... گورا ... اور .... لاکھا ...... اور بھوری جسے بچہ دیئے ابھی ایک مہینہ بھی پورا نہیں گزرا تھا اور ابھی تک اس کے دودھ سے کچی کلیوں کی خوشبو آ رہی تھی .... شرر .... فرر .... شرر ...." وہ خود بخود مسکرا اٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے بھوری کے تھنوں سے دودھ کی دھار اپھوٹ بہی ہو اور پیتل کی بالٹی کا پیندا دھاروں کی مضراب سے دوتارے کی طرح بج اٹھا ہو اور دودھ سے جھاگ اٹھ رہا ہو۔ سفید سفید جھاگ جس میں موتیے کی کلیاں اور چودھویں کی چاندنی گھل مل گئی ہو۔

"بھوری دودھ اور گھی کے لئے علاقے بھر میں مشہور تھی۔ مست کور کا ذیلدار تہمد کی ڈب میں ہزار روپے کے نوٹ باندھ کر آیا پر میں نے کہا "چوہدری! بھوری میری جان ہے۔ اپنی جان کو کون بیچتا ہے بھلا؟"!

پھر وہ یکایک اُداس ہو گیا۔

" نہ جانے اب بھوری کس کے پاس ہے ؛ اس رات . . . ." اسے جھرجھری سی آئی۔

اُس رات کا تصور بہت بھیانک تھا۔ نرم نرم چمکیلی دھوپ میں وہ اس اندھیری رات کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے رفتار تیز کرلی لیکن اس کے خیالات اس سے بھی زیادہ تیز رفتار تھے۔ گورا، لاکھا اور بھوری بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ انہیں چھو نہ سکتا تھا لیکن وہ گورے اور لاکھے کے پسینے کی باس سونگھ رہا تھا اور بھوری کے دودھ کی خوشبو . . . .

" ہوں! سڑک کے عین درمیان اتنا بڑا گڑھا" وہ چونک گیا۔

"یہاں کوئی گولا گرا ہوگا" اس نے سوچا "اب میں وہاں پہنچ چکا ہوں۔ جہاں جنگ ہوئی تھی"

" جنگ! "

"جنگ کتنے چپکے سے آئی تھی جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں بلکہ رات کے اندھیرے پر . . . . . "

وہ اس دن حسبِ معمول کنوئیں پر سو رہا تھا، لاکھے، گورے اور بھوری کے پاس کھاٹ بچھا کر برسات بھر کر نہیں لگی تھی اور دھان کے کھیتوں کو پانی دینے کے لئے لاکھا اور گورا سارا دن کنواں چلاتے رہے تھے اور اب وہ تھک کر تھان پر لیٹ چکے تھے۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ کھاٹ پر لیٹتے ہی اسے نیند آگئی تھی۔ وہ سو رہا تھا کہ وہ دبے پاؤں آگئی۔

سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ ایک مقام پر یکدم رُک گیا۔

یہاں سے ایک پگڈنڈی پھوٹتی تھی جو بل کھاتی ہوئی سیدھی اس کے گاؤں تک چلی جاتی تھی۔ اس رستے میں کنویں تھے اور گاؤں آباد تھے اور ہر گاؤں کے باہر برگد یا آم کا درخت تھا جہاں لوگ بیٹھے حقہ پی رہے ہوتے۔ تعارف کے لئے صرف ایک "سلام علیکم" کی ضرورت تھی۔ پانی یا لسی کا ایک پیالہ پی کر، حقے کے دو کش لگا کر، مسافر تازہ دم ہو جاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ جب سے سڑک پکی ہوئی تھی، لوگ پگڈنڈی کو بھول گئے تھے لیکن جب دشمن نے سڑک پر قبضہ کر لیا تو لوگ اس پگڈنڈی کی رہنمائی میں امن کی جگہ تک پہنچ سکے تھے۔

اب وہ پگڈنڈی غائب تھی۔

کھیتوں کی مینڈھیں ٹوٹ چکی تھیں اور کھلے میدان میں دور دور تک کوئی نشان ایسا باقی نہیں تھا جو پگڈنڈی کو واضح کرتا تاہم سڑک سے کچھ دور ہٹ کر درختوں کا وہ جھنڈ موجود تھا جو تھکے ہوئے مسافر کے لئے پہلی مہمان سرائے کا کام دیتا تھا۔ وہ اس طرف چل پڑا۔ درختوں میں گھرا ہوا، کنواں غیر آباد تھا اور وہ سوکھے پتوں، گھاس پھوس اور ٹوٹی ہوئی خشک شاخوں سے اٹ گیا تھا۔ جھنڈ سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے مورچے ابھی تک موجود تھے۔ وہ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

اس دن جب وہ رات کی پُر اسرار اور بوجھل خاموشی سے چونک کر بیدار ہوا تھا تو ایک انجانا خوف کوڑیالے سانپ کی طرح رینگ کر آیا تھا اور اس کے لمس سے اس

کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ تب سرحد کی طرف سے جو کنویں سے بہت دور نہیں تھی۔گولیوں کے چلنے کی آواز آئی تھی۔ پکی سڑک پر ٹرک اور جیپوں کے چلنے کا شور بلند ہوا تو وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ یہ فیصلہ اس نے اچانک کیا اور اس میں اُس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ گورے، لاکھے اور بھوری کو کنویں پر چھوڑ آیا تھا حالانکہ اسے گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر بھوری تھان پر کھڑی ہو گئی تھی جیسے پوچھ رہی ہو "کہاں جا رہے ہو؟"

گاؤں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جنگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ اس نے بیناں اور بچوں کو ساتھ لیا اور اسی پگڈنڈی پر آپہنچا جو سڑک کے متوازی اس سے دور دور چلتی تھی اور اس کے دونوں طرف کھیتوں اور درختوں کا حصار تھا اور پگڈنڈی اس کے کنویں کے پاس سے گزرتی تھی لیکن وہ اس کے باوجود گورے، لاکھے اور بھوری کو ساتھ نہ لے سکا۔ وہ نفسا نفسی کے عالم میں ان کو بھول گیا جو مدتوں سے اس کے دکھ سکھ کے ساجھی تھے۔ اس نے اپنی جان کو عزیز سمجھا۔ وہ کتنا بے وفا نکلا تھا۔

لیکن وہ رات قیامت کی رات تھی۔

اس رات باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے بچھڑ گئی تھی اور اس کے ساتھ تو اس کے بال بچے تھے۔ یہ بھی کیا کم تھا کہ وہ انہیں نہیں بھولا تھا۔ وہ ساری رات چلتے رہے اور جب پو پھٹی تو وہ پگڈنڈی اور سڑک کے نقطۂ اتصال پر پہنچ گئے۔ اس کنویں پر مورچے کھد رہے تھے اور توپوں کے دہانے آسمان کی طرف کھلے ہوئے تھے۔

"اب ہم خدا کے فضل سے محفوظ ہیں"۔ اس نے سوچا۔

لیکن ایک سپاہی نے اونچی آواز میں کہا "یہاں مت رکو۔ آگے بڑھ جاؤ۔ تم بھی دشمن کی زد میں ہو۔"

ابھی وہ دو چار قدم آگے بڑھے تھے کہ درختوں کے جھنڈ پر پہلا گولا گرا اور ان کے پاؤں کے نیچے زمین کانپ گئی۔ پھر آسمان سے گھر گھر کی آواز آئی۔ ایک ہوائی جہاز تڑ تڑ گولیاں برساتا ہوا ان کے سر پر سے گزر گیا۔ سارے سپاہی دھم سے زمین پر لیٹ گئے۔ وہ اور جیناں بچوں کی انگلیاں پکڑے بُت بن کر کھڑے رہے۔

ایک جوان نے آواز دی "لیٹ جاؤ۔ زمین پر لیٹ جاؤ۔ ہوائی جہاز ابھی پھر آئے گا۔"

وہ زمین پر لیٹ گئے اور چاروں طرف سے ڈز ڈز کی آوازیں آئیں۔ آسمان دھواں دھار ہو گیا۔ پھر وہی جہاز ان کے سر پر سے گزرا تو ڈگمگا رہا تھا اور اس کی دم سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ مورچے کے پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جیناں کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ جیناں بچوں کو انگلی لگا کر چلنے لگی تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا چہرہ کورے کاغذ کی طرح سفید تھا۔ تب سورج نکل آیا اور سیالکوٹ شہر کی عمارتیں دھوپ میں نہا کر نکھر آئیں۔

"جیناں! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم بچ گئے۔ وہ دیکھو سامنے شہر نظر آ رہا ہے۔"

"اچھا!" جیناں نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"اب ڈر کی کوئی بات نہیں" اس نے جیناں کو تسلی دی۔

"ڈر کی بات.... نہیں تو....." جیناں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"واہ! اب رونے کی کیا بات ہے بھلا؟ اب ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا دشمن اب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"بھوری!" جیناں نے دبی دبی سسکیوں میں کہا۔

"بھوری!" وہ حیران ہو گیا۔

پھر اس نے قہقہہ لگا کر کہا "تمہیں بھوری یاد آ رہی ہے۔ میرا گورا اور لاکھا..."
تب قہقہہ اس کے گلے میں پھنس گیا۔

اس نے کہا "جیناں! میں جب کنویں سے گاؤں آیا تھا تو تینوں تھان پر بندھے تھے۔"

"گورا اور لاکھا تو منہ زور ہیں۔ گولے پھٹیں گے تو ان کی آواز سن کر رسے تڑا لیں گے پر بھوری اور اس کا بال تھان پر بندھے بندھے....؟"

"جیناں!" اس کا قہقہہ چیخ بن گیا۔

"بھوری میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے رات اس کے لئے بنولے اور کھلی بھگو کر رکھ دیئے تھے۔ وہ مڑ مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھتی ہوگی۔ اس کا بال بھوک اور پیاس سے بلک رہا ہوگا۔ وہ کھونٹے کے گرد چک پھیریاں لے رہا ہوگا۔"

"جیناں چپ رہو۔ میں مجبور تھا۔ برستی آگ میں سے کس کس کو بچا کر لاتا؟"

"تم بھوری کی گردن سے رسّہ ہی نکال آتے۔"

"مجھے کیا پتہ تھا کہ اب کنویں پر جانا نصیب نہیں ہوگا۔"

جیناں خاموش ہوگئی اور وہ اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ وہ بچوں کو انگلی لگائے چلتا رہا اور تھان پر بندھی بھوری جس نے اس کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال رکھا تھا، اس کی طرف معصوم آنکھوں سے تکتی رہی جیسے کہہ رہی ہو، میں دس سال سے تمہارے پاس ہوں۔ میرے دم سے تمہارے گھر میں دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں تمہارے گھر کی یہ رونق میرے قدموں سے ہے۔ میں تمہارے بچوں کی دوسری ماں تھی۔ میں تمہاری ماں تھی۔ کیونکہ تم نے میرے تھنوں سے دودھ پیا۔ اب وقت پڑنے پر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ تم کتنے خودغرض ہو۔ میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔

نہیں مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔۔۔۔۔ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔۔،

"جیناں!" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کہو۔"

"تم حمزہ غوث کا رستہ جانتی ہو نا؟۔۔۔۔۔ اڈہ پسرور سے دکھن کی طرف۔۔۔۔ نالہ ایک، کا پل ہے نا، اسے پار کر کے۔۔۔۔۔"

"کہو۔"

"وہاں چوہدری کرم دین ہے۔ وہ کئی بار ہمارے گاؤں آیا تو ہمارے ہاں مہمان بن کر رہا۔"

"ہاں میں اسے جانتی ہوں۔"

"تم اس کے گھر چلے جانا۔"

"پر تم؟......"

"میں بھوری کو تھان سے کھول کر واپس آجاؤں گا....." اس نے بڑے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ جیناں چند لمحوں تک اس کو نہ سمجھ سکی۔ تب حقیقت چڑیل کی طرح منہ پھاڑے آئی تو وہ اس کے دامن سے چمٹ گئی۔

"جیناں! اگر میں نہ گیا تو بھوری تھان پر سسک سسک کر مر جائے گی۔"

"نہیں!" جیناں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔

"اب تم محفوظ ہو۔ مجھے جانے دو۔"

"دیکھو تو۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ تم برستی آگ سے زندہ سلامت کیسے نکل آؤ گے؟"

"میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ فکر نہ کرو جیناں!"

جیناں نے اس کا دامن چھوڑ دیا اور بچوں کو انگلی لگا کر سیالکوٹ کا رخ کر لیا۔ وہ قدم قدم پر مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ چند لمحوں تک اسے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ایک قافلے میں مل کر گم ہو گئے تو زمین اس کے قدموں سے چپک گئی وہ بے حسی کے عالم میں کھڑا رہا۔ تب اس نے اپنے گاؤں کی طرف منہ موڑ کر دیکھا اس وقت سیالکوٹ کی طرف سے ایک گولہ اڑتا ہوا آیا اور اس کے سر پر سے سیٹیاں بجاتا ہوا گزر گیا۔ نجانے اس گولے کی منزل کہاں تھی لیکن تھرتھراتی ہوئی زمین نے اس کے قدموں کو آزاد کر دیا۔

وہ اسی پگڈنڈی کے متوازی چلتا رہا اور کھیتوں کی آڑ میں اپنے کنویں کی طرف

بڑھتا چلا گیا۔ گولے اس سے دور دور پھٹ رہے تھے۔ اور گھر گھر ٹینک چل رہے تھے۔ پھر اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نجانے کس طرف سے دو جہاز آ گئے اور سڑک پر افراتفری پھیل مچ گئی۔ ٹینک کھیتوں میں بدحواس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ وہ ایک گڑھے میں لیٹ گیا۔ جہاز غوطہ لگا کر اس کے سر پر سے گزرتے تو اسے یوں لگتا جیسے وہ درختوں کی پھننگوں سے ٹکرا جائیں گے۔ تب گولیوں کی بارش ہوتی، درختوں سے شاخیں کٹ کٹ کر گرتیں اور سڑک سے دھواں اٹھتا۔ پھر اس نے دیکھا کہ دشمن کے ایک دوڑتے ہوئے ٹینک پر جہاز شکرے کی طرح لپکا۔ جہاز سے ایک شعلہ نکلا اور ٹینک بھک سے اڑ گیا۔ اس کا دل دہل گیا۔ وہ خواہ مخواہ جہنم کی آگ میں کود پڑا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

چند منٹوں بعد جہاز اس کے سر پر سے گزر کر دور فضاؤں میں گم ہو گئے۔ لیکن دیر تک سڑک اور اس کے ارد گرد کئی مقامات سے دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف بلند ہوتے رہے۔ وہ گڑھے میں لیٹا رہا اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اچانک اسے اپنا فرض یاد آ گیا۔ تب روح کے کسی گوشے سے طمانیت کی ایک لہر ابھری اسے یوں لگا جیسے ان جہازوں نے اس کے سر پر اپنے پروں کا سایہ ڈال کر اسے حفاظت کے حصار میں لے لیا ہو۔ وہ دشمن کے نرغے میں اکیلا نہیں تھا۔

وہ پھر کھیتوں کی آڑ میں چلنے لگا اور سلامتی کا سایہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ جب کنوئیں پر پہنچا تو شام پڑ چکی تھی اور ہو کا عالم طاری تھا۔ بھوری تھان پر لیٹی بڑی بے کسی کے عالم میں گاؤں کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھے۔ لاکھا اور گورا رسّے تڑا کر بھاگ چکے تھے۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر بھوری یکدم اٹھ بیٹھی اس

نے بڑھ کر اس کی گردن میں بازو ڈال دیئے۔ اس نے کہا "دیکھو بھوری!
میں آن پہنچا"

اس نے بھوری کے گیلے گیلے منہ پر ہاتھ پھیرا اور بھوری اس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ بھوری کا بال اپنے کھونٹے کے گرد چک پھیریاں لینے لگا۔ بھوری کا شیردان دودھ کے بوجھ سے اکڑ گیا تھا۔ اور تھن پھول کر لٹک گئے تھے۔ اس نے بال کے گلے سے رسّہ نکال دیا۔ بال بھوری کی طرف لپکا اور اس کے تھنوں سے دودھ خود بخود ٹپکنے لگا۔ بال نے تھنوں پر مُنہ ڈال دیا۔ وہ چُسر چُسر دودھ پیتا رہا اور وہ پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ سیر ہو گیا تو اس نے تھن ہاتھ میں لئے اور دودھ کی دھاریں شرر شرر اس کے حلق میں گرنے لگیں نیم گرم میٹھے دودھ کی دھاریں....

تب اس نے بھوری کے گلے سے اپنی غلامی کا قلادہ نکال دیا اور کہا۔

"بھوری! یہ سب کھیت تیرے ہیں۔ جب تک تیرا دانہ پانی ہے، مزے سے چر چُگ۔ تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یوں اللہ کے سوا کون جانتا ہے کہ میری اور تیری قسمت میں کیا لکھا ہے" بھوری دِن بھر کی بھوکی تھی لیکن وہ تھان سے نہ ہلی۔ اس نے اس کے پُٹھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اس کے آگے آگے چل پڑی جوار کے کھیت میں پہنچ کر بھوری نے نوخیز پودوں پر مُنہ ڈالا ہی تھا کہ وہ اندھیرے کی اُوٹ لے کر بھوری سے جدا ہو گیا۔ اس نے سیالکوٹ کا رخ کر لیا۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا پر وہ خوش تھا کیونکہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اب قیامت کے روز اسے بے زبان بھوری کے سامنے جوابدہ تو نہیں ہونا پڑے گا۔

وہ اٹھا اور پھر سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اکثر مقامات پر سڑک پس کر چورا ہو گئی تھی۔ کھیت ویران تھے اور ان کی مینڈھیں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ قدم قدم پر ویرانیاں بڑھ رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جل گئی ہو۔ وہ یکایک اداس ہو گیا حالانکہ اب تک وہ کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کٹھن وقت بھی خوش رہا تھا۔ جب وہ گھر سے بے گھر سے ہو گئے تھے جنگ کی خبریں سن سن کر اس خون چلو ڈوں بڑھا تھا بلکہ اپنے سپاہیوں کی قربانیوں کی ایک ایک داستان پر اس نے رگ رگ میں ایک نئے خون کو گردش کرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ اپنے گھر بار ڈھور ڈنگر کی قربانی دے کر بہت مطمئن تھا کہ اس نے بھی اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ وہ کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا۔

اور اب وہ اپنے فرض کی تکمیل کے لئے اپنے گاؤں جا رہا تھا کیونکہ وہ ایک دلیر قوم کا جری کسان تھا جس کے کندھوں پہ پوری قوم کا بوجھ تھا اور اب مایوسی دھیرے دھیرے اس کے انگ انگ میں رچتی چلی جا رہی تھی۔

"مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیئے" اس نے زیر لب کہا۔

لیکن مایوسی کا بوجھ بڑھتا گیا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتا رہا، بوجھ بھاری ہوتا رہا۔

اس نے گاؤں تک کا فاصلہ اس تھکے ہوئے مزدور کی طرح طے کیا جس کے سر پر منوں بوجھ ہو اور منزل ابھی دور ہو اور ہر لمحہ بوجھ میں اضافہ کر رہا ہو۔

اُس کا گاؤں اجڑا ہوا تھا۔ گلیوں میں ملبے کے ڈھیر تھے۔ مکانوں کی چھتیں غائب تھیں۔ دیواروں پر آگ اور دھویں کے نشانات ابھی تک تازہ تھے۔ کواڑ

اور کھڑکیاں جل گئے تھے۔ راکھ اڑ رہی تھی۔ وہ اپنے جلے ہوئے مکان کے سامنے چند لمحوں کے لئے رکا۔ پھر ویرانی منہ پھاڑ کر دوڑی تو وہ ڈر کر کھلے کھیتوں کی طرف بھاگ نکلا۔

کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ درخت کٹ چکے تھے۔ اس کے کنویں کے گرد درختوں کا جو جھنڈ تھا، وہ غائب تھا۔ کٹے ہوئے درختوں کے ٹھنٹھ دیکھ کر اس کا جی بیٹھ گیا۔ اس کی ڈھاری کی چھت گر گئی تھی اور ہر چیز سے وحشت ٹپک رہی تھی اس نے آنکھیں بند کرلیں جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ تھان پر کھڑا تھا، گورے، لالے اور بھوری کے کھونٹے موجود تھے اور ابھی تک رسوں کے گلے سڑے پیچ کھونٹوں کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے۔ کنویں کی منڈیر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی لوہے کے ڈھول اور چکر تڑ مڑ کر چورا ہو گئے تھے۔ زنگ آلود ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ مال، کنویں میں گر گئی تھی۔

کٹے ہوئے درختوں کے درمیان صرف ایک مڑا تڑا پودا سلامت تھا۔ اور اس کی ایک شاخ سرسبز تھی اور اس پر بھورے رنگ کی ایک چڑیا بیٹھی اسے گول گول حیران آنکھوں سے تک رہی تھی۔

یکایک وہ چڑیا بول اٹھی "چوں۔۔۔۔ چوں۔۔۔ چوں"
جیسے پوچھ رہی ہو "تم آ گئے؟ میں کب سے اکیلی تھی اور تمہارا انتظار کر رہی تھی"!

وہ چونک کر جاگ اٹھا۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ چڑیا کے نغمے سے روشنی کی ایک کرن پھوٹ نکلی تھی۔

پھر وہ ڈھاری کی پشت پر کے کھیت میں چلا گیا۔ کھیت کی مٹی کا رنگ سیاہ تھا۔ اس نے مٹی کی لپ بھری اور اسے سونگھا۔ ابھی تک اس سے بارود کی بو آ رہی تھی اس نے مٹی کو پھینک کر سوچا " مٹی راکھ بن گئی ہے۔ راکھ سے کوئی شے جنم نہیں لیتی "!

تب وہ ڈھاری کے اندر گیا۔ اس نے ملبے میں ٹامک ٹوئیے مارے ایک کسی پر اس کا ہاتھ پڑ گیا۔ اس کا دستہ درمیان میں سے ٹوٹا ہوا تھا اور پھل کو زنگ کھا گیا تھا، تاہم دستے پر ہاتھ کی گرفت خود بخود مضبوط ہو گئی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں۔ وہ کسی ہاتھ میں لئے کھیت میں آ گیا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر کسی کو ہاتھوں میں تولا۔ زمین پر پہلا ٹپ لگا تو چڑیا نے چوں چوں چوں کا مسلسل راگ چھیڑ دیا جیسے وہ خوشی سے پاگل ہو گئی ہو۔

ایک ٹپ . . . . .

دوسرا ٹپ . . . . .

اور تیسرے ٹپ پر سرخ سرخ مٹی کے چند ڈھیلے باہر نکل آئے۔

اس نے ایک ڈھیلا ہاتھ میں لیا اور اسے آہستہ آہستہ مٹھی میں پیسا۔

پھر اس نے مٹھی کھول دی۔ بھربھری مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔

اس خوشبو میں بھاگن چیت کی بارش کی نمی بھی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے مٹی سے زندگی کا چشمہ پھوٹ بہا ہو۔ "مٹی زندہ ہے"! اس نے خوش ہو کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کے سفید ٹکڑے اڑ رہے تھے۔ سوندھی سوندھی خوشبو چار کھونٹ بکھر گئی۔

ایک لہر کٹے ہوئے، جلے ہوئے درختوں سے ٹکرائی اور اس کے لمس سے شگوفے پھوٹ نکلے اور شاخیں ہری بھری ہوکر برگ و بار سے لد گئیں۔ تھان پر گورا اور لاکھا جھومنے لگے اور بھوری کے تھنوں سے دودھ کی نہریں بہہ نکلیں۔ رُوں رُوں رہٹ چلا۔ چاندی کی لکیر بل کھا کر کھیتوں کی طرف رینگنے لگی اور تب یکایک کھیتوں میں سبزے کی چادریں بچھ گئیں اور ان پر سہ پہر کی سنہری دھوپ لہرانے لگی۔

ایک لمحے کے اندر اندر اس کا کنواں آباد ہوگیا تھا۔

وہ کتّی ہاتھ میں لئے کھیتوں کی لہر بہر دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

(۳۱ جولائی ۱۹۶۸ء)
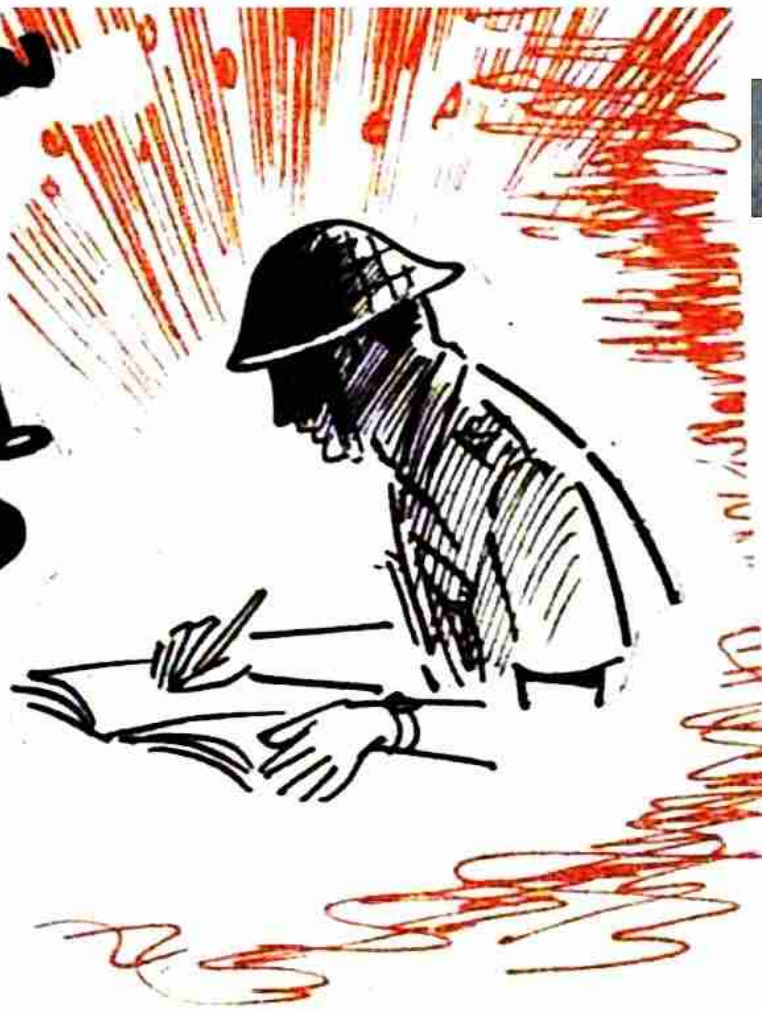
سپاہی کی ڈائری

سپاہی کی ڈائری

جب میں سیالکوٹ کے سرحدی گاؤں 'ن' میں داخل ہوا تو گلی کے آغاز پر الجھے ہوئے بالوں والی ایک دبلی پتلی لڑکی نے میرا استقبال کیا۔ اس نے موٹی موٹی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ان آنکھوں میں الاؤ روشن تھے اور پتلے پتلے چہرے پر راکھ ٹھنڈی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا سارا جسم اس آگ میں جل کر راکھ ہو گیا ہو۔

میں مدتوں بعد اس گاؤں میں آیا تھا۔ یہ گاؤں جنگ میں اجڑ کر ابھی نیا نیا آباد ہوا تھا۔ ابھی تک پورے مکان بھی نہیں بنے تھے۔ اس کے گلی کوچوں کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ مجھے چوہدری صاحب کے گھر کا پتہ نہیں مل رہا تھا۔

میں نے پوچھا "بی بی! چوہدری اللہ داد کا مکان کس طرف ہے؟"

"خط لائے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"خط؟ ..... نہیں تو ..... کس کا خط؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

میرے ہاتھ میں سنہری تھیلا دیکھ کر لڑکی کو شاید مجھ پر ڈاکیے کا گمان ہوا تھا۔

"میں نے خط لکھوایا تھا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔" اس نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔

"بی بی! میں ڈاکیہ نہیں۔ تمہیں غلطی لگی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پھر وہ رو پڑی "میرا خط کوئی نہیں لاتا ..... میرا خط ....."

اور مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے پانی نہیں، خون بہہ رہا ہو۔

"آپ کس سے ملیں گے؟" ایک ادھیڑ عمر کے سفید پوش نے مجھ سے دریافت کیا۔

"چوہدری اللہ داد سے۔"

"آئیے میرے ساتھ۔"

چوہدری اللہ داد ابھی اپنے مکان کے صرف دو کمرے بنوا سکے تھے میں اگلے چند دنوں کے لئے جس کمرے میں ٹھہرا، وہی ان کی بیٹھک کا کام بھی دیتا تھا۔ یہاں گاؤں کے لوگ سہ پہر سے شام تک ضرور بیٹھتے اور حوالدار رحمت خاں سے میری خوب گاڑھی چھننے لگی۔ وہ فوج سے چھٹی پر آئے تھے۔ لہٰذا وہ تاش کی چوکڑی جمانے اور چونکہ سترہ دن کی جنگ میں سے گزرے تھے، اس لئے کھیل کے دوران جنگ کے دلولہ انگیز واقعات بھی بیان کرتے چلے جاتے۔ مجھے ان کی زبانی شجاعت کے

کئی بے مثال کارناموں کے سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سپاہی اختر علی کا واقعہ بھی انہوں نے مجھے سنایا اور اس کی ڈائری بھی مجھے پڑھنے کے لئے دی۔
اس دن حوالدار رحمت خاں ہی مجھے چوہدری صاحب کے گھر تک لائے تھے۔

"وہ ایک شرمیلا سا سپاہی تھا جو اپنا فرض بڑی ذمہ داری سے ادا کرتا،" حوالدار رحمت خاں نے کہا، "اتفاق کی بات ہے کہ رنگروٹی پاس کرنے کے بعد وہ میری ہی پلٹن میں آ لگا۔ ہم دونوں گرائیں بھی تھے اور رشتہ دار بھی۔"
دن بھر ڈیوٹی دینے کے بعد جب وہ بیرک میں واپس آتا تو کوئی نہ کوئی رسالہ یا کتاب لے کر چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ پلاٹون کے لوگ محبت اور مذاق سے اسے منشی اختر علی کہا کرتے تھے۔ وہ اپنے خط بیشتر اسی سے لکھواتے۔ خاص طور پر نوجوان سپاہی جن کی نئی نئی شادیاں ہوئی تھیں۔ وہ ان خطوں میں کوئی نہ کوئی ایسا شرمایا ہوا فقرہ لکھ دیتا تھا جس کے جواب میں انہیں نئی نویلی دلہنوں کی خیر خیریت کی خبر بھی مل جاتی ورنہ والدین اکثر ان کا ذکر گول کر جاتے ہیں اور بیٹے شرم کے مارے صاف صاف دلہنوں کا حال بھی نہیں پوچھ سکتے۔ اسے خود بھی ایسے خط لکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ دسویں جماعت پاس کر کے چار سال تک کاشتکاری کرتا رہا تھا۔ وہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں ہل کی ہتھی رہی اور دوسرے میں قلم۔ اس نے ان دنوں دو چار کہانیاں بھی لکھی تھی جو بچوں کے ایک رسالے میں شائع ہوئی تھیں۔
ایک اتوار وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بازار گیا۔ اس نے اپنی ضرورت کی کچھ

چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ ایک دو رسالے بھی لئے اور ایک دکان پر ایک خوبصورت سی نوٹ بک دیکھ کر اس کا جی للچا گیا۔ اس نے وہ نوٹ بک بھی خرید لی۔ بیرک میں پہنچ کر اسے خیال آیا کہ آخر اس نوٹ بک کی کیا ضرورت تھی کہ میں اسے خرید لایا اس نے سوچا ور اس سے تو بہتر تھا کہ میں ڈائری خرید لیتا۔ کم از کم مہینے کے دن یاد رہتے ہیں۔ اس میں روزانہ کا حساب کتاب ہی لکھتا رہتا۔"

نوٹ بک کئی دنوں تک اس کے صندوق میں پڑی رہی۔

ایک دن اس کی اس پر جو نظر پڑی تو ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں چمکا اس نے نوٹ بک نکالی، قلم ہاتھ میں لیا اور کانپتے ہاتھوں سے پہلے صفحے پر لکھا۔

روز نامچہ ـــــ

مملوکہ و مقبوضہ سپاہی اختر علی اختر

پلاٹون ڈی۔ کمپنی سی ..... پاک رجمنٹ۔

دوسرے صفحے پر کوئی تاریخ ڈالے بغیر اس نے لکھنا شروع کیا:۔

اس ڈائری میں میں جو کچھ لکھوں گا، سچ ہوگا۔ خدا مجھے اس کی توفیق دے۔

سب سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنی زندگی کے مختصر حالات لکھ دوں اور اس کے بعد ڈائری شروع کروں۔

میں گاؤں ،ن، میں پیدا ہوا۔ میرا گاؤں پاکستان اور مقبوضہ جموں وکشمیر کی سرحد سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے اور میرا کنواں تو سرحد سے صرف تین چار فرلانگ دور ہے۔ میں نے سولہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور چار سال

تک کہیں ملازم نہ ہو سکا۔ میں نے کاشتکاری میں باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے کنویں پر ڈیرہ جما لیا۔ میں راتیں بھی اکثر کنویں پر گزارتا۔ کبھی کبھار دن کے وقت جب کام سے فراغت ہوتی اور باپ کنویں پر ہوتا تو میں گاؤں میں بھی چلا جاتا پر تنہائی میں کنویں پر رہنے کا جو مزہ آتا، وہ گاؤں میں نہ ملتا۔ نجانے کیوں؛ میرا باپ کہا کرتا تھا "اختر! تو نے پڑھ لکھ کر بھی ہل ہی چلانا تھا تو مجھے پہلے بتا دیتا۔ میں تمہیں دسویں پاس کیوں کرواتا؟" میں کہا کرتا تھا "ابا! میں دسویں پاس ہوں۔ کون سا ڈی، سی لگ جاؤں گا؟ کوئی اچھی سی نوکری مل گئی تو چلا جاؤں گا پر دسویں پاس کو کوئی اچھی سی نوکری ملے گی بھی کہاں سے؟"

میں ہل چلاتا رہا اور فصلیں بوتا رہا یہ مشغلہ ہے بھی بڑا دلچسپ۔ فصلوں کی بوائی سے کٹائی تک کے زمانے میں بڑے عجیب عجیب مشاہدے ہوتے ہیں۔ بیج پھوٹتا ہے، کونپل نکلتی ہے اور پودا لہرا لہرا کر پروان چڑھتا ہے۔ اس پہ بچپن بھی آتا ہے، جوانی بھی اور بڑھاپا بھی۔ وہ اس مختصر سی زندگی میں زمانے کے سارے گرم سرد چکھ لیتا ہے۔ میں نے کنویں پر بکائن کا ایک پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ وہ میرے دیکھتے دیکھتے بڑھا اور پھلا پھولا لیکن مجھے یہ عام سی بات معلوم ہوئی۔

لیکن ایک دن مَیں اس کی چھاؤں میں بیٹھا تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔

"ارے تو وہی ننھی سے بکائن ہے جسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا" میں نے کہا "اب تو اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں تیرے سائے تلے بیٹھا ہوں"

اور مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میری بات سن کر بکائن نے قہقہہ مارا ہو۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"تم ..... تم یہاں؟" میں نے گھبرا کر تتلاتے ہوئے کہا۔

"تم گاؤں نہ آؤ، تو میں بھی کنوئیں پر نہ آؤں۔"

"پر اس جلتی دوپہر میں! ......" میری آواز میں تھوڑا سا غصہ بھی تھا۔

"میرے رستے میں کونسا تھل تھا؟"

"پر حمیداں! تمہیں کوئی دیکھ لیتا تو ......"

"میری بلا سے ...... تم تو نجانے کن باتوں میں الجھ گئے۔ مہمانوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟"

"مہمان ..... کون مہمان؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تمہارے مہمان ہیں؟"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

میں نے پوچھا "ہر طرح سے خیریت ہے نا؟ سفر اچھی طرح سے کٹا؟ کوئی لسی شربت پئیں گے آپ؟ مکّی کے بھٹے بھون کر کھلاؤں آپ کو؟"

وہ شرما کر سرخ ہو گئی۔ اس کے اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ میں نے اسے لسی پلائی۔ ٹھنڈی لسی پی کر اس نے مجھے جھکی جھکی آنکھوں سے دیکھا۔ ان میں شرم و حیا کی اوس تھی اور کچھ اور بھی تھا۔ میرے پاس (اور) کے لئے لفظ نہیں پر اس لمحے میں ایک ٹھنڈی میٹھی آگ میں جل رہا تھا۔ میں اٹھا اور کھیت میں چلا گیا۔ میں نے بھٹے توڑے اور سوکھی لکڑیاں اکٹھی کیں۔ آگ پر بھٹے رکھ کر ہم زمین پر پاس پاس بیٹھے رہے اور چار کھونٹ چلچلاتی دھوپ میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سی لگی رہی۔ اس نے بھٹے کھائے اور پھر وہ چلی گئی۔ اس نے جاتے ہوئے کہا "اب

تمہیں گاؤں میں آنا پڑے گا۔"

"اچھا!" میں نے کہا۔

اب سونے کا وقت ہو چکا ہے۔ بیرک کی بتیاں بجھ رہی ہیں۔ باقی حالات پھر لکھوں گا۔

بہت دنوں کے بعد آج لکھنے کا موقع ملا ہے۔ رجمنٹ سکیم پر گئی ہوئی تھی ذرا بھی فرصت نہ ملی۔

اس دن حمیداں کے جانے کے بعد میں یکایک اُداس ہو گیا۔ اس کا اور میرا بچپن کا ساتھ تھا۔ مدتوں سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ چلی آ رہی تھی۔ لیکن اس دن عین دوپہر کو اس نے کنویں پر آ کر مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد کوئی لمحہ ایسا نہ آیا جب اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے نہ رہی ہو۔ سرخ سرخ رسیلے ہونٹ، گدرایا ہوا جسم۔ سر پر نیلا دوپٹہ۔ مجھے نیلے رنگ سے بڑی محبت ہے اور وہ جھکی جھکی شریری سی آنکھیں جو نیلے آسمان کی اوٹ میں صبح کے ستاروں کی طرح چمکتی ہیں، ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتیں۔ میں تو ان مدھ بھری آنکھوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ گرمیوں کا لمبا دن گزرنے ہی میں نہیں آتا۔ لیکن اس دن وقت پر لگا کر اڑا اور شام پڑ گئی میں لے ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال سے فارغ ہو کر، کھاٹ پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند آ گئی۔ اچانک سرحد کی طرف گولی چلی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ سمگلروں سے ہر روز رینجروں کی جھڑپیں ہوتی ہیں۔ اس دنے میں پھر اونگھ گیا۔ تب مجھے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ یہ بڑی دردناک چیخ تھی۔ میں کانپ گیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں تو کیا تھان پر بندھے مویشی بھی خوف

کے مارے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں دوڑ کر "ڈھاری" کے اندر سے رائفل اٹھا لایا۔ ہم سرحد پر رہنے والوں کو اسلحہ ملا ہوا ہے کافی عرصے کے بعد سرحد سے قریب ہمارے آخری کھیت کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی پر مجھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ میں نے اندھیرے میں سائے کی طرف شست باندھ لی اور کہا۔

"کون ہے؟"

"مجھے بچائیے۔"

"آگے نہ بڑھو۔ رک جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

"مجھے نہ مارو....." یہ آواز کسی ڈری سہمی عورت کی تھی۔

میں چپ ہو گیا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ کنویں کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ میں ایک لمبی سوچ کے بعد اس پر آمادہ ہو سکا کہ بے ہوش عورت کو اٹھا کر چارپائی پر ڈال دوں اور خود رائفل لے کر پہرہ دیتا رہوں۔ گرمیوں کی وہی رات جو آنکھ جھپکنے میں گزر جایا کرتی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک لمحے سے چپک کر رہ گئی ہو اور گزر نہ رہی ہو۔ خدا خدا کر کے پو پھٹی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جوں جوں روشنی شوخ ہوتی رہی، میں اس کی چارپائی سے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا رہا۔ اچانک میرا باپ میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے کڑک کر پوچھا۔

اس کی آواز سن کر وہ بے ہوش لڑکی کانپ اٹھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں

کھلیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں پتھرایا ہوا شدید خوف دیکھ کر میرا باپ حیران ہو گیا۔
اس نے اب کی بار دھیمے سے پوچھا "بتاؤ نا یہ کون ہے ؟"
"میں نہیں جانتا..... پہلے سرحد کی طرف گولی چلی۔ پھر چیخ کی آواز آئی۔ تب میں نے سرحد والے کھیت کی پگڈنڈی پر ایک سایہ دیکھا۔ یہ لڑکی یہاں پہنچ کر بے ہوش ہو گئی۔"
میرا باپ کھاٹ کے قریب پہنچ کر بڑے نرم لہجے میں بولا "لڑکی تم کون ہو ؟"
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
"بولو بیٹی..... ڈرنے کی کوئی بات نہیں"
میرے باپ کے لہجے کی نرمی اور شفقت پر پتھرائی ہوئی آنکھوں میں کچھ جان سی پیدا ہوئی بہت دیر بعد اس نے سرحد پار کے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کیا جس کے پکے مکان دھوپ میں چمک رہے تھے۔
"تم اس گاؤں کی رہنے والی ہو ؟" میرے باپ نے پوچھا۔
اس نے سر ہلا دیا۔
"تم کس کی بیٹی ہو ؟"
"سادن مَل....."
"سادن بٹوال ؟"
"جی !"
"میں سادن کو جانتا ہوں بیٹی۔ اس کے رشتہ دار ہمارے گاؤں میں اب

بھی بستے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے وہ کبھی کبھار ہمارے گاؤں میں آیا کرتا تھا۔
لیکن تم بھاگ کر اس طرف کیوں آئیں ؟"

اس سوال پر لڑکی نے آنکھیں جھکا لیں جیسے کہہ رہی ہو یہ سوال مجھ سے نہ پوچھئے۔
دیر بعد اس نے آنکھیں اٹھائیں تو وہ ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ پھر ان سے ٹپ ٹپ آنسو
بہنے لگے۔

"بتاؤ نا بیٹی !"

"میں اور میری چھوٹی بہن سرحد کے ساتھ گائیں چرا رہی تھیں "

وہ رک گئی۔

"پھر کیا ہوا بیٹی ؟"

"وہ ہمیں پکڑ لے گئے۔"

"کون ؟"

"دو سپاہی "

"کس طرف کے ؟"

یہ سوال پوچھتے وقت میرے باپ کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔

"ادھر کے " لڑکی نے سرحد پار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری طرف کے ؟" میرے باپ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

اس جواب پر میرے باپ کا چہرہ یکایک روشن ہو گیا۔

اس نے مسکرا کر کہا "بیٹی ! اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ ہماری طرف کے

سپاہی ایسے نہیں۔ پھر کیا ہوا بیٹی ؟"

"ہم نے شور مچانا چاہا تو انہوں نے ہمارے منہ میں رومال ٹھونس دیئے۔"

"پھر ؟"

"میں نہیں جانتی ۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔۔۔۔۔ مجھ سے نہ پوچھئے۔"
اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے ۔

"تم بھاگ نکلیں ؟" میرے باپ نے پوچھا۔

"جی ہاں! رات کے اندھیرے میں ۔۔۔" اس نے بدستور آنکھوں پر ہاتھ رکھے رکھے جواب دیا۔

"تمہاری چھوٹی بہن ؟"

"ہم دونوں بھاگ نکلی تھیں ۔ انہوں نے گولی چلادی ۔ میں نے اس کی چیخ سنی تھی ۔ میں نہیں جانتی اس کا کیا بنا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میں یہاں کیسے پہنچی ۔"

لڑکی خاموش ہوگئی ۔ میرا باپ سوچنے لگا۔ میں بھی سوچنے لگا پر میری سوچ کا دھارا بار بار اس لڑکی کی طرف مڑ جاتا رہا۔ میں نے سوچا کیا دونوں بہنوں کی عزت بچ گئی ۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش ایسا ہی ہو۔ لیکن جب میں نے اس لڑکی کے الجھے ہوئے بال، زخمی کلائیاں اور چھلے ہوئے ہونٹ دیکھے تو میرا تن بدن کانپ گیا۔ رائفل پر میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی۔

"اختر علی !"

"جی !"

"میں رینجروں کے پاس جارہا ہوں۔ وہی اس لڑکی کو اس کے وارثوں کے ہاں پہنچانے کا انتظام کریں گے۔"

"نہیں ....." اس لڑکی کی چیخ سی نکل گئی۔

میرا باپ کانپ گیا۔ تب وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے باپ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کہا "مجھے وہاں نہ بھیجو چاچا۔ میں اب ان کے لئے مر چکی ہوں۔"

لیکن میرا باپ مُصر تھا کہ اسے رینجروں کے پاس ضرور جانا چاہیئے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بار بار یہی کہتا رہا "بیٹی! انہیں بتائے بغیر میں تمہیں پناہ نہیں دے سکتا۔"

لڑکی نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا "آبا! اسے کیوں نہ اپنے گاؤں کے بٹوالوں کے ہاں پہنچا دیا جائے۔"

"تم جا کر گلاب بٹوال کو بلا لاؤ۔"

لڑکی نے میری طرف احسان سے بوجھل جن نگاہوں سے دیکھا وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔

بٹوال اچھوت قوم ہے۔ یہ لوگ گورے چٹے، وجیہہ، خوبصورت اور شریف ہوتے ہیں۔ تقسیم ملک پر ان میں سے اکثر ہماری طرف آباد رہے اور ادھر نہ گئے۔ اب یہ بہت امن داماں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گلاب بٹوال نے لڑکی کو اپنی پناہ میں لینے کا وعدہ کر لیا تو وہ دونوں رینجر پوسٹ پر گئے اور وہاں اس واقعہ کی اطلاع دی۔ ادھر سے لڑکی کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہ ہوا بلکہ کہتے ہیں کہ دفتری خط

و کتابت میں انہوں نے اس کا وجود ہی تسلیم نہ کیا سرکار نے گلاب بٹوال کو باقاعدہ اجازت دے دی کہ وہ لڑکی اس کے ہاں رہے۔ میں ابھی فوج میں بھرتی نہیں ہوا تھا کہ اس کی شادی گلاب بٹوال کے بیٹے سے ہوگئی۔ میں نے لڑکی کا بھائی بن کر شادی میں حصہ لیا۔ وہ بڑی نیک اور حیا دار لڑکی ہے۔ مجھے ویر کہہ کر پکارتی ہے تو میرا سینہ فخر سے تن جاتا ہے۔

ایک دن میرے باپ نے ایک کام کے سلسلے میں مجھے تحصیل میں بھیجا۔ ڈاک بنگلے میں میلہ سا لگا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ بھرتی ہو رہی ہے۔ میں بھی بھرتی ہونے والوں کی صف میں کھڑا ہو گیا اور مجھے بھرتی کر لیا گیا۔ گھر آیا تو دو چار دِن بعد فوج سے بلاوا آ گیا۔ بابا کو پتہ چلا تو وہ حیران ضرور ہوا لیکن اس نے مجھے روکا نہیں۔ رنگروٹی کا زمانہ بڑا سخت تھا۔ جب یہ زمانہ گزرا تو یوں لگا جیسے میں پہلے جیسا اختر علی نہیں رہا ہوں۔ میرے اندر کچھ عجیب تبدیلی آگئی ہیں ایک کسان سے سپاہی بن گیا ہوں۔

رنگروٹی کے بعد اپنی پلٹن میں حاضر ہوا تو دس دن کی چھٹی مل گئی۔ میں جب گاؤں میں پہنچا تو مجھے گاؤں بھی کچھ اجنبی اجنبی سا لگا۔ میں کتنے تھوڑے سے عرصے میں بیرک کی زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ میں خود بھی حیران تھا۔ اس کے باوجود دنوں کے گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ رات پڑتے ہی تکیے میں دوستوں کے ساتھ گپ بازی جو شروع ہوتی تو آدھی رات بیت جاتی اور اٹھنے کو جی نہ چاہتا دن چڑھے جاگتا۔ اس وقت گاؤں کی گلیوں میں دھوپ ہوتی۔ میں کنوئیں کی طرف نکل جاتا۔ شام پڑتی تو لوٹتا۔

ایک دن رام پیاری نے شام کے جھٹ پٹے میں میرا دامن تھام کر کہا، "ویرا! فوج میں جا کر ہم سب کو بھول گئے ہو؟"

"نہیں تو ......"

"اس بیچاری نے تو مدتوں سے تیری راہ میں آنکھیں بچھا رکھی تھیں۔"

"کون بیچاری؟"

"ابھی کہہ رہے تھے تم کہ میں تو کسی کو نہیں بھولا۔"

"نہیں تو ......"

"اب آئے ہو تو اسے خواہ مخواہ ترسا رہے ہو۔"

"نہیں تو...... میں تو...... اسے ملنا چاہتا ہوں پر مجھے شرم آتی ہے۔"

رام پیاری نے پیار سے میرے گال تھپتھپا کر کہا "میرا ویر تو لڑکیوں سے بھی زیادہ چھوئی موئی ہے۔"

تب شرم کے مارے میری کنپٹیاں تمتمانے لگیں۔

"اس نے بھی پوچھا تھا کہ تیرا منہ بولا بھائی تجھے ملنے کے لئے کیوں نہیں آیا؟"

"کس نے؟"

"اس نے۔" رام پیاری شرما گئی۔

"وہی نا جو جب آتا ہے تو سرسوں پر پھول آ جاتے ہیں اور جاڑا اڑ جاتا ہے" میں نے کہا۔

"چل شریر کہیں کا؟" رام پیاری نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا،

"بسنت لال سے کہنا۔ میں کل صبح کنویں پر جانے سے پہلے گھر آؤں گا۔"

دوسرے دن میں صبح صبح رام پیاری کے ہاں گیا۔ بسنت لال گھر پر نہیں تھا۔ رام پیاری نے بتایا کہ اسے کوئی کام پڑ گیا ہے۔ اس نے میرے لئے صحن میں کھاٹ بچھا رکھی تھی اور اس پر اجلی چادر بھی تھی۔ میں نے اس کی خدمت میں دس روپے نذر کئے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا "ویرا! جگ جگ جیو" اور اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ میں کسی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا اور میری نظر رام پیاری کے گھروندے کی طرف جا پڑی۔ کھلے دروازے میں دہلیز سے ذرا آگے مجھے وہ نظر آئی۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ بس ایک نظر! میں اس کے چہرے کی ایک جھلک بھی نہ پا سکا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے پر میرے پاس وہ لفظ بھی نہیں تھے جن سے میں اسے منا لیتا۔

رام پیاری اس کے پاس گئی۔ اس نے اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ بولی۔

"بس ٹھیک ہے پیارو۔"

میں رام پیاری کے گھر سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ میں نے کنویں کا رخ کر لیا میرا باپ ہل چلا رہا تھا۔ میں نے ہل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور سارا دن کسی نہ کسی کام میں جٹا رہا جیسے میں اسے بھول جانا چاہتا تھا لیکن وہ سارا دن میرے ساتھ ساتھ رہی۔ پر میری طرف سے منہ پھیر کر۔ میں بہانے بہانے کئی بار اس کی گلی میں گیا۔ میں اسے دیکھ نہ سکا۔ میں کنویں پر جا کر کام کرتا رہتا اور وہ مجھ سے منہ پھیرے میرے ساتھ ساتھ رہتی اور تب ایک لمحہ ایسا آیا جب وہ گلاب کی باس کر میرے تن من میں رچ بس گئی۔

چھٹیوں کے آخری دن کی بات ہے میں حسب معمول اس کی گلی سے گزرا تو وہ سامنے سے آ گئی۔ وہ میرے پاس سے یوں گزر گئی جیسے ہوا کا ایک جھونکا۔ ہوا کے ہلکورے پر پیغام آیا "اگلی بار چھٹیوں میں آؤ، تو سب سے پہلے اس گلی میں آنا"۔ میں کنویں پر چلا آیا۔ باپ ہل میں پھالا لگوانے کے لئے گاؤں میں لوہار کی دکان پر آیا ہوا تھا۔ کنویں کی فضا پر خاموشی طاری تھی۔ کھیتوں پر زرد زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے سوچا "کل مجھے صبح صبح گاؤں چھوڑ دینا ہے ...... کل ..... لیکن آج کتنا خوبصورت ہے ...... زرد دھوپ .... بے نام سی خوشبو ..... سرسبز کھیت ...." یکایک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں چونک اٹھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ دھوپ میں چمک رہی تھی، اتنی اجلی، نکھری نکھری مسکراہٹ جیسے ابھی ابھی اوس میں دھل کر آئی ہو۔ اور پھر سرخ سرخ ہونٹوں سے مل کر مسکراہٹ میں آگ لگ رہی تھی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے اس کے وجود سے دھوپ کو بھی روشنی ملی ہو اور وہ کلی کی طرح چٹک کر خوشبو بن گئی۔ روشنی خوشبو اور آگ .....

میں نے چونک کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئیں؟"

"جی چاہا تو آ گئی۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے یہی سمجھا کہ میں خیال ہی کی دنیا میں اس سے بات کر رہا ہوں۔

تب میں خوشی کے طوفان میں تنکے کی طرح بہہ گیا۔

میں نے کہا "کسی نے دیکھ لیا تو"

"مجھے ڈر نہیں۔"

"تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"تم نے گلی کے سو پھیرے لگائے۔ بس ایک بار بھی نہ آتی۔"

"اچھا تو اب جاؤ۔"

"نہیں .... میں ابھی نہیں جاؤں گی۔"

"ابا گاؤں سے آنے والا ہے۔"

"آنے دو۔ مجھے کچھ نہیں کہیں گے وہ۔"

اتنے میں میرا باپ آگیا۔ وہ حمیداں کو کنویں پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی میری اور کبھی حمیداں کی آنکھوں میں جھانکا۔

پھر اس نے پوچھا "بیٹی! ساگ توڑنے آئی ہو؟"

"جی .... نہیں تو .... جی ہاں۔ جی ہاں .... اس کنویں کا ساگ بڑا اچھا ہوتا ہے نا چچا؟"

"ہاں بیٹی۔ جاؤ۔ ساگ توڑ کر جلدی گھر پہنچو۔ ساگ پکتا بھی تو بڑی دیر سے ہے۔ کہیں تمہیں کنویں پر ہی شام نہ پڑ جائے۔"

جب وہ چلی گئی تو ابا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ نہ جانے اس مسکراہٹ کا کیا مطلب تھا؟

میں دوسری صبح منہ اندھیرے گھر سے نکل کر گلی میں آیا تو ایک سایہ میرے پیچھے پیچھے لگ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سایہ میرا اپنا ہو اور اب مجھے کوئی اس سے جدا نہ کر سکتا ہو۔ گلی کے موڑ پر اس نے مجھے الوداع کہا۔ صبح کی پاکیزہ خاموشیوں

میں وہ لفظ میری روح کی گہرائیوں میں ٹیک گیا۔

۲۵ جولائی ۶۵ء

خط ابھی ابھی گھر والوں کو لکھا ہے۔ اپنی خیریت کی خبر دی ہے۔ جس کی خیریت میں پوچھنا چاہتا ہوں، حسبِ معمول اس کا ذکر بھی نہ کر سکا۔ دوسروں کے لئے خط لکھتا ہوں تو ان میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور لکھ دیتا ہوں۔ جس کے جواب میں انہیں اپنی دلہنوں کی خیریت کی خبر مل جاتی ہے پر حمیداں ابھی دلہن بھی تو نہیں بنی۔۔۔۔۔۔ میں اسے دلہن کے روپ میں کیوں دیکھ رہا ہوں۔ آسمانی رنگ کا دوپٹہ۔ لمبا گھونگھٹ، ہاتھوں پر مہندی، جھکی جھکی آنکھوں میں کاجل۔ وہ پلکیں کتنی لمبی ہیں جیسے جھالر بن کر آنکھوں پر گر رہی ہوں، یہ آنکھیں میرے ساتھ ساتھ رہی ہیں جیسے انہیں میری جدائی گوارا نہ ہو۔ میں ہر موڑ پر انہیں دیکھتا ہوں جیسے وہ میری نگرانی کر رہی ہوں۔ میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں بھلا۔۔۔۔۔ پر ایک بات عجیب ہے کہ میں جب بھی حمیداں کو دلہن کے روپ میں دیکھتا ہوں، تو میرے دل میں دور بہت دور غم کی ایک لہر کیوں اٹھتی ہے۔ شائد اس لئے کہ میں نے ابا سے اپنے دل کی بات نہیں کی۔ اب میں خط میں لکھتے لکھتے شرما جاتا ہوں۔ میں اماں سے بھی نہ کہہ سکا۔

۳۱ جولائی ۶۵ء:-

ابھی ابھی حوالدار صاحب نے ایک خط میری طرف پھینکا ہے۔ ذرا اسے پڑھ لوں تو۔۔۔۔۔ میں نے خط پڑھ لیا ہے۔۔۔۔۔ ابا نے اتنی بڑی خبر لکھوائی ہے کہ وہ میرے قلم کی گرفت میں نہیں آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ کیا یہ سچ ہے۔۔۔

اتنی بڑی خبر...... میں نے ابھی ابھی حمیدآں کے سرخ سرخ ہاتھوں کو دیکھا ہے اور ان سے مہندی کی تازہ تازہ گرم گرم خوشبو کا ایک جھونکا آیا ہے۔ اور میں نڈھال سا ہوکر رہ گیا ہوں...... یہ خبر ضرور سچ ہے.... بھلا مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟

یکم اگست ۶۵ء

آج ایک اڑتی ہوئی خبر ملی ہے کہ مجاہدین نے مقبوضہ جموں کشمیر میں جنگ آزادی کا آغاز کر دیا ہے.... میں نے آج گھر میں خط لکھ دیا ہے کہ مجھے رشتہ منظور ہے۔ میں یہ فقرہ لکھ کر بہت ہنسا۔ اگر حمیداں یہ فقرہ سن لے تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے

۱۵ر اگست ۶۵ء

کوئی حکم تو پڑھ کر نہیں سنایا گیا لیکن فوج اپنے آپ چوکنی اور ہوشیار ہو گئی ہے۔ کام بہت بڑھ گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان، آنے والا ہو۔ جموں کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیاں شدت اختیار کر گئی ہیں دشمن جھلا کر آزاد کشمیر کے علاقوں پر حملہ کر رہا ہے۔

یکم ستمبر ۶۵ء

آج صبح صبح اخبار میں خبر پڑھی کہ جموں کشمیر کے مقبوضہ علاقے میں آزاد کشمیر کی فوجوں نے پاکستان کی افواج کی مدد سے چھمب جوڑیاں پر حملہ کر دیا ہے۔

۲ر ستمبر ۶۵ء:- ہماری رجمنٹ "موو" کر گئی ہے۔ سارا دن مورچے

کھودتے گزری ہے۔ اب مورچے تیار ہو چکے ہیں۔ میں نے جلدی جلدی میں دو لفظ لکھ لئے ہیں۔

۶ر ستمبر ۶۵ء

جنگ شروع ہو گئی ہے دشمن نے الٹی میٹم بھی نہیں دیا۔ جنگ کے دنوں میں ڈائری لکھنے کا وقت نہیں ملے گا۔ اب قلم سے کھیلنے کا وقت نہیں۔ میں سپاہی ہوں۔ میری انگلی رائفل کے ٹریگر پر ہر وقت رہتی ہے۔ لاہور خطرے میں ہے۔ جوان موت سے کھیل جانا چاہتے ہیں ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جاری ہے لیکن ہر چہرہ مسکرا رہا ہے۔ اس قسم کی مسکراہٹ آج سے پہلے میں نے کسی چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

۲۳ر ستمبر ۶۵ء

کیا جنگ ختم ہو گئی ہے؟ یقین نہیں آ رہا۔ رات دشمن نے فائر بندی کے لئے تین بجے کی مہلت طلب کی تھی۔ اور اس عرصے سے یہ فائدہ اٹھایا کہ ہر محاذ پر بھرپور حملہ کر دیا۔ کتنی شرافت کی بات ہے؟ رات تین بجے تک جو جنگ ہوئی، اس کی شدت میں ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ پتہ نہیں دشمن کو کیا سوجھی کہ وہ آتش فشاں کے دھانے میں گھس آیا اور بھسم ہو کر رہ گیا..... میں نے غلط کہا ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی البتہ فائر بندی ہوئی ہے..... یہ عارضی جنگ بندی ہوئی ہے رائفل کی نال ہر وقت آگ اگلنے کو تیار ہے۔

۲۵ر ستمبر ۶۵ء

جنگ کے دنوں میں تو اخبار وغیرہ پڑھنے کی فرصت بھی نہ ملی۔ اب عجیب

عجیب باتیں سننے میں آ رہی ہیں ۔ یہ بات سن کر بڑی ہنسی آئی ہے کہ دشمن چھ ستمبر کی صبح کو لاہور پہنچ کر جام شراب پینا چاہتا تھا ۔ اسے اتنا بڑا دعوے کرتے وقت یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اس کے رستے میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں ..... ہر سپاہی ایک پہاڑ تھا ..... دشمن ان سے سر پھوڑتا رہا اور ٹکرا کر تباہ ہو گیا ۔

اب میں اپنی ایک تشویش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ، میرا گاؤں مقبوضہ جموں کشمیر کی سرحد سے بالکل قریب ہے ۔ جب دشمن نے سیالکوٹ کی طرف یلغار کی ہو گی تو میرا گاؤں پہلی ہی رات جنگ کی لپیٹ میں آ گیا ہو گا ۔ میں نے سترہ دنوں میں اپنے گاؤں کے متعلق ایک لمحے کے لئے بھی کچھ نہ سوچا ۔ سچ جانیئے ان دنوں مجھے حمیداں بھی یاد نہ آئی ۔ میرا فرض سب یادوں پر مقدم رہا ۔ گاؤں سے کوئی خط نہیں آیا ۔ اب مجھے اپنے دل پر کچھ بوجھ سا محسوس ہوتا ہے ۔ حمیداں کا چہرہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے وہی سرخ سرخ مسکراتے ہوئے ہونٹ ..... شریر آنکھیں ..... لیکن میں اس مسکراہٹ میں غم کی ایک ہلکی سی لہر بھی دیکھتا ہوں ...... وہی جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے ..... لیکن یہ میرا وہم ہے ..... آج میں گھر خط لکھوں گا ..... لیکن کہاں ؟ ..... کس پتے پر ؟ .....

ایک بات میں نے اب تک چھپائے رکھی ہے یعنی ڈائری میں نہیں لکھی میں چاہتا تھا کہ یہ خبر سب سے پہلے حمیداں کو ملے ..... وہ کتنی خوش ہوتی ..... اچھا اب اسے کاغذ کی نذر کر دیتا ہوں ..... میں نے سنا ہے ایک

ایک تمغے کے لئے میرے نام کی سفارش ہوئی ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے.... یوں میں نے کوئی بڑا کارنامہ بھی نہیں دکھایا تھا کہ تمغے کا اہل بنتا۔ ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی رات کو رینجروں کی جس چوکی سے قریب ہمارے مورچے تھے، وہاں حملہ ہوا تو رینجر مقابلے میں ڈٹ گئے لیکن اتنی بڑی فوج کے سامنے وہ کب تک ٹھہرتے وہ چوکی چھوڑ کر برستی آگ میں ہمارے مورچوں کی طرف آ گئے۔ ایک زخمی رینجر میرے مورچے سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز دور پہنچ کر گر گیا۔ اندھیرے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ جب صبح ہوئی تو سب سے پہلے میری نظر اس پر پڑی۔ اس لئے حوالدار سے میں نے کہا کہ اس رینجر کو میں اٹھا کر لاؤں گا۔ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے اللہ نے میری مدد کی اور میں اسے اٹھا کر لے آنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہر سپاہی نے اس سے بھی بڑے بڑے کارنامے دکھائے تھے..... تاہم میں خوش ہوں کہ قوم کی طرف سے مجھے اتنا بڑا اعزاز ملنے والا ہے۔

یکم اکتوبر ۶۵ء

ابھی ابھی ابا کا خط ملا ہے۔ وہ حملے کی رات کو خیریت کے ساتھ گاؤں سے نکل کر ڈسکے کے قریب موضع ا س ، میں رشتہ داروں کے پاس رہ رہے ہیں۔ میں خط پڑھتا رہا اور خط میرے ہاتھ میں کانپتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھائی رہی۔ اس خط میں حمیداں کا کوئی ذکر نہیں۔ میں لکھ کر پوچھ لوں؛ کیا یہ مناسب ہو گا؟ پوچھنے میں کیا ہرج ہے؟

۱۰ر اکتوبر ۶۵ء

۔ خط کا جواب آ گیا ہے لیکن ابا نے حمیداں کا ذکر نہیں کیا۔ اب سپاہیوں کو

چھٹیاں ملنی شروع ہوگئی ہیں۔ میں نے بھی چھٹی کی درخواست دے دی ہے۔

یکم نومبر ۶۵ء

چار دن کی چھٹی منظور ہوگئی ہے۔ نجانے مجھے کیوں خوشی نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے تو جب چھٹی ملی تھی، میرے تن بدن میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں اور آج..... آج مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں کسی جنازے کو کندھا دینے کے لئے چھٹی لے رہا ہوں۔ کل شام چلا جاؤں گا۔

۳ر نومبر ۶۵ء

ابّا اور اماں سے ملاقات ہوئی۔ چھوٹے بہن بھائی بھی ملے۔ دشمن گاؤں میں اچانک آپہنچا تھا۔ گاؤں کے لوگ کسی نہ کسی طرح سے نکل آئے۔ ساتھ کچھ نہ لا سکے۔ جنگ میں ایسی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ مجھے کچھ بھی افسوس نہ ہوا۔ ابّا نے گاؤں سے نکلنے کا منظر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن حمیداں کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ دشمن حمیداں کے محلے کی طرف سے گاؤں میں داخل ہوا تھا۔ افراتفری میں کسی کو کوئی ہوش نہ رہا۔ ابّا باہر گئے تو میں نے اماں کا دامن پکڑ لیا اور حمیداں کے متعلق پوچھا۔ اماں نے منہ موڑ لیا میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ پتہ نہیں اس کے گھر کے لوگ کہاں ہیں۔ ذرا حالات ٹھیک ہو لیں، تو پتہ چل جائے گا۔"

"اماں! کیا حمیداں مر چکی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم پگلے؟!"

"وہ کہاں ہے اماں؟ کچھ تو بتاؤ۔ دیکھو میں تمہاری منت کرتا ہوں۔"

"چوہدری اللہ داد کی زبانی اتنا پتہ چلا تھا کہ اس کے گھر کے لوگ گاؤں سے نکل آئے تھے اور ......"

اماں نے رک کر میری طرف دیکھا ۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ۔

"اور وہ ؟" میں نے پوچھا۔

"خدا کرے وہ مرگئی ہو" انہوں نے کہا اور دو آنسو خود بخود ٹپک پڑے ۔

میں ایک دو لمحوں کے لئے زمین اور آسمان کے درمیان لٹکا رہا۔ پھر ایک خیال سے دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

اب رات کا وقت ہے میں لالٹین کی روشنی میں یہ ڈائری لکھ رہا ہوں ۔ میں پو پھٹنے کا انتظار کر رہا ہوں چپکے سے نکل جاؤنگا۔"

۴/ نومبر ۶۵ء

میں اپنے گاؤں سے کئی میل دور اپنی ایک چوکی پر اپنی فوج کا مہمان ہوں ۔ میرا گاؤں دشمن کے قبضے میں ہے ۔ وہاں جانے کی کوشش کرنا خودکشی کے برابر ہے ۔ کون جانے وہاں حمیدہ اس ہے بھی یا نہیں ۔ موضع 'ڈ' کے قریب ہمارے مورچوں کے متعلق ایک عجیب خبر سننے میں آئی ہے ۔ ابھی ابھی کوئی سپاہی سنا رہا تھا کہ وہاں سپاہیوں کو جنگ بندی کے معاہدے پر قائم رکھنا مشکل ثابت ہو رہا ہے ۔ میرے پوچھنے پر اس نے جو کچھ بتایا ، اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ناله 'پ' کی دوسری طرف دشمن کا قبضہ ہے ۔ وہاں دھان کے کھیت پک گئے ہیں دشمن کے سپاہی رائفلیں تان کر پہرہ دیتے ہیں اور کچھ لڑکیاں دھان کاٹتی ہیں ۔ وہ سردی سے ٹھٹھرتی ہیں ۔ ان کے بدن پر پورے کپڑے بھی نہیں ۔ دشمن کے

سپاہی ان سے بُرے بُرے مذاق بھی کرتے ہیں۔ ایک لڑکی نجانے کس طرح بھاگ نکلی۔ وہ رات کے اندھیرے میں نالے کے اس پار آنکلی۔ پہرے والے سپاہی نے پوچھا "کون ہے؟" لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے کہا "ہالٹ! ..... آگے نہ بڑھو ورنہ گولی چلا دوں گا"

لڑکی نے کہا "ویرا! ضرور گولی مار دینا پر پہلے میرا سندیسہ سن لے"

اس لڑکی نے موضع "ڈ" کے سپاہیوں کو جو کچھ سنایا، وہ میری زبان پر نہیں آسکتا۔ اس سپاہی نے کہا جو قصہ سنا رہا تھا "پر وہ ان لڑکیوں کی طرف سے جو دشمن کے قبضے میں تھیں، یہ سندیسہ لے کر آئی تھی کہ کل جب ہم کھیتوں میں آئیں تو ہمیں گولی مار دینا"

ہمارے افسروں کو معلوم ہوا تو دشمن کو فوراً نتیجے سے خبردار کر دیا گیا اور دوسرے دن وہ لڑکیاں کھیتوں میں نہ آئیں ورنہ وہاں جنگ ہو جاتی۔ پھر بھی جوانوں کے دِل غصّے سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں یہ واقعہ سن کر نڈھال سا ہوگیا جیسے کسی نے میرے تن سے جان کھینچ لی ہو۔ ہم نے فاضلکا اور کھیم کرن میں دشمن کی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا اعتراف دشمن کے لیڈروں نے کیا تھا۔

میں صبح کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں موضع "ڈ" میں جاؤں گا۔ میں اُس مظلوم لڑکی سے مل کر ساری کہانی سنوں گا۔

۵/ نومبر ۶۵ء

کل رات میں نے جو قصہ سنا تھا، وہ سچ ہے لیکن اس لڑکی کو میرے گاؤں

کا کچھ پتہ نہیں ۔ کل میری چھٹی کا آخری دن ہے ۔ مجھے حمیداں کا پتہ ضرور ملنا چاہیئے
جب میں نے اپنی اس مظلوم بہن کو بتایا کہ حمیداں بھی ؤقت پر گاؤں سے نہ نکل
سکی تھی ، خدا کرے کہ وہ زندہ نہ ہو تو وہ رو پڑی ۔ اس نے کہا " وہ ضرور
زندہ ہے دیرا موت کے لئے ہم بھی دعائیں مانگا کرتی تھیں پر وہ کسی خوش نصیب
کو نہ ملی "
میں اپنے گاؤں جاؤں گا ۔ کون جانے حمیداں زندہ ہو اور وہ میرا انتظار
کر رہی ہو ۔

۲۵ ، نومبر ۶۵ ء

میں ہسپتال میں ہوں ۔ میری حالت اچھی ہے ۔ آج مجھے چارپائی پر تکیے سے
ٹیک لگا کر بیٹھنے کی اجازت ملی ہے ۔ میں نے منت خوشامد کر کے نرس سے
اپنی ڈائری مانگ لی ہے ۔ اس نے میرا پین بھی مجھے دے دیا ہے ۔ آج
بہت کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے لیکن جو کچھ میں نے دیکھا ہے ، کیا وہ لکھ
بھی سکوں گا ۔ میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے ۔ اب پھر اٹھا لیا ہے میں
لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا ۔ میرا قلم بار بار رُکے گا لیکن میں اسے چلنے پر مجبور
کروں گا ۔

میں حیران ہوں کہ میں اپنے گاؤں کس طرح پہنچا ۔ یہ گاؤں ہماری چوکی
سے کم از کم پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے ۔ پانچ چھ میل کا فاصلہ لمبا نہیں
لیکن قدم قدم پر دشمن موجود ہو تو یہی سفر قیامت کا سفر ہوتا ہے ۔ میرا کوئی پہنا
نہیں تھا ۔ میں اپنے سپاہیوں سے بھی نظر بچا کر نکلا تھا ۔ میں نے کسی سے اپنے

ارادے کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ مجھے دشمن کے علاقے میں کون جانے دیتا۔ ایک سپاہی سے میں نے باتوں باتوں میں دشمن کی پوزیشن کا تھوڑا بہت پتہ چلا لیا تھا میں اس نالے کے کنارے کنارے چلتا رہا جو ہمارے اور دشمن کے علاقے کی عارضی حدبندی کر رہا تھا۔ میں نے اس مقام پر نالے کو پار کیا۔ جہاں سے کبھی میرے گاؤں کو ایک پگڈنڈی پھوٹتی تھی۔ یہاں سے قدرت نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اندھیرا میرا رہنما بن گیا۔ اندھیرے ہی میں اس ٹیلے کا سایہ ابھرا جس کی اوٹ میں میرا گاؤں ہے۔ میں ٹیلے سے آگے نہ بڑھا۔ اس کے قریب ایک دھان کے ایک کھیت میں چھپ کر پو پھٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ بہت لمبے انتظار کرتا رہا۔ بہت لمبے انتظار کے بعد روشنی ہوئی۔ سب سے پہلے مسجد کا مینار اندھیرے کو چیر کر مسجد کا مینار ابھرا۔ میرا دل دھڑکا۔ پھر مکانوں کے دھندلے نقش نظر آئے۔ تب میں یکایک اتنا اداس ہوگیا کہ میرے تن بدن میں جان نہ رہی۔ گاؤں قبرستان کی طرح سنسان اور ویران تھا۔ کھیتوں کو عرصے سے پانی نہیں ملا تھا۔ اس لئے دھان کے پودے اتنے اونچے نہیں تھے کہ میں ان میں بیٹھ کر چھپا رہتا۔ میں کھیت میں پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ تب صبح کی چڑیا چہچہانے لگی اور میرے تن بدن میں دھیرے دھیرے زندگی کی لہر دوڑنے لگی پھر صبح ہو گئی اور روشنی پھیل گئی۔ تب بھی گاؤں نہ جاگا۔ میں نے سوچا کہ گاؤں مر چکا ہے اور اس کے ساتھ حمیداں بھی مر چکی ہے۔ اس بات پر مجھے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا گویا ایک بوجھ سینے سے اتر گیا ہو۔

۲۶، نومبر ۶۵ء:۔ کل میں بہت کچھ اور لکھنا لیکن نرس نے میرے ہاتھ

سے ڈائری چھین لی۔ آج ابھی ابھی لکھنے کی اجازت ملی ہے۔

میں نے دھان کے کھیت میں لیٹے لیٹے سوچا کہ اگر گاؤں سورج نکلنے پر بھی نہ جاگا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ سورج نکلا تو گاؤں کی طرف سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ میں چوکنا ہو گیا۔ یہ محض بھنبھناہٹ کی آواز تھی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون باتیں کر رہا ہے۔ میں نے آواز پر کان لگا دیئے اور میری سننے کی طاقت دفعتاً تیز ہو گئی۔ تب مجھے صاف معلوم ہو گیا کہ کچھ عورتیں باتیں کر رہی ہیں اور وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہی ہیں۔ میں کھیت میں اور بھی دبک گیا اور پھر مجھ سے اگلا کھیت کٹنے لگا۔ میں کھیت کے کٹنے کی آواز سن رہا تھا۔ اب میں خوفزدہ نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وقت اس مقام پر آ کر رک گیا ہو اور میں اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں تھی لیکن مجھے کیا معلوم کہ یہ عورتیں کون ہیں اور تب مجھے موضع دڈا، کا واقعہ یاد آ گیا اور میرا کلیجہ منہ کو آ گیا اور زمین کانپی جیسے زلزلہ آ گیا ہو اور میری غیرت نشتر بن کر مجھے کچوکے دینے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اچانک اٹھوں اور کھیت میں پہنچ کر کہوں "بہنو! تمہارا بھائی آ گیا ہے"۔ میں نے اپنے جوش کو بڑی مشکل سے دبایا۔ مسلسل لیٹے رہنے سے میرا بند بند دکھنے لگا اور اس طرح صدیاں بیت گئیں۔ دھان کا کھیت کٹتا رہا اور آوازیں میرے قریب آتی رہیں تب دھان کے دو متوازی کھیتوں کو جدا کرنے والی مینڈھ پر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پہلو بدل لیا اور مینڈھ کی طرف کان لگا دیئے۔ مینڈھ پر سے چاپ کی آواز گزر گئی۔ میں گزرنے والے پاؤں بھی نہ دیکھ سکا۔

حالانکہ میں ان سے کتنا قریب تھا۔

دھان کے کٹے ہوئے کھیت سے آواز آئی "ہالٹ"

وہ قدم رُک گئے۔

ایک نسوانی آواز نے کہا "ہم بھاگ تو نہیں رہیں"

"واپس آجاؤ۔"

"چلو لوٹ چلیں" وہ عورت بولی۔

"نہیں ..... میں نہیں جاؤں گی .... تم لوٹ جاؤ ....." دوسری نسوانی آواز نے جواب دیا۔ یہ آواز بڑی غمناک تھی۔

"لوٹ آؤ ..... صاحب کا حکم نہیں ہے" مردانہ آواز نے پکار کر کہا۔

"ہم ٹیلے تک ہو کر لوٹ آئیں گی"

"نہیں ...... میں گولی مار دوں گا"

"اسے کہو وہ گولی چلا دے۔ میں نہیں جاؤں گی" غم ناک آواز نے آنسوؤں میں ڈوب کر کہا اور مجھے یوں لگا جیسے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی یہ آواز مجھ سے پہلے بھی کبھی ہم کلام ہوئی تھی۔ میں نے سوچا نہیں یہ میرا وہم ہے"

"لوٹ چلو حمیداں! کیوں ضد کر رہی ہو پگلی"

"حمیداں! ایک بجلی چمکی اور میرے تن بدن کو چاٹ گئی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اس ایک لفظ پر عقاب کی طرح جھپٹتا اور اسے اپنے پنجوں میں لے کر اڑ جاتا اور کہتا "دیکھ حمیداں! میں آخر آپہنچا"

پر ایسا نہ ہو سکا۔ کسی انجانے ہاتھ نے مجھے کندھوں سے دبا کر مری طاقت

سلب کرلی۔

"نہیں . . . . ." حمیداں نے کہا۔ "مجھے خدا کے لئے یہیں رہنے دو۔ اسے کہو گولی مار دے مجھے۔"

"پاگل نہ بنو۔ ہم ٹیلے تک جا کر کریں گے بھی کیا؟"

"پیارو! جاؤ۔ مجھے یہیں رہنے دو۔"

"اچھا! میں اس سے پوچھ آتی ہوں۔ تم یہیں بیٹھ جاؤ۔ آگے نہ جانا۔"

نرس آرہی ہے اب وہ ڈائری چھین کرلے جائے گی۔ میں اس کے آنے سے پہلے خود ہی لکھنا بند کر دیتا ہوں۔

۲۷ / نومبر ۶۵ء

پیارو کے جانے کے بعد حمیداں مینڈھ پر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی لیکن میں اس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ میں کتنا بے بس تھا۔ میرے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ "تو زندہ ہے حمیداں؟ تو زندہ کیوں ہے حمیداں؟" اور اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے زندہ دیکھنے کے لئے اپنے گاؤں نہیں آیا تھا۔ میں تو یہ معلوم کرنے کے لئے آیا تھا کہ حمیداں مرچکی ہے اس نے سینے پر گولی کھائی اور مسکراتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ وہ دشمن کے ہاتھ نہ لگی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ میں سوچتا رہا اور دھان کا کھیت مسلسل گھٹتا رہا اور وقت ایک لمحے پر رک کر بھی، گزرتا رہا۔ دھوپ سے گرمی آہستہ آہستہ رخصت ہوتی رہی اور میرے اور دھان کاٹنے والیوں کے درمیان فاصلہ تدریج کم ہوتا چلا گیا۔

رام پیاری نے آواز دی "وہ نہیں مانتا حمیداں۔ ٹیلے تک جانا"۔

حمیداں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس آواز پر میرے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ میں رینگ رینگ کر مینڈھ کی طرف بڑھنے لگا اور حمیداں سے دو قدم کے فاصلے پر جا کر رک گیا۔ حمیداں گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔ اس نے دھان کی سرسراہٹ بھی نہ سنی۔ میں نے کہا "میں اختر ہوں حمیداں"۔

حمیداں نے سر اٹھا کر آنسوؤں کی دھند میں سے مجھے دیکھا، تو وہ لاش کی طرح زرد پڑ گئی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ سوکھے پتے کی طرح کانپی۔ پھر اس نے کہا "تم......تم.....اختر......"

میں نے کہا "میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔"

"تم یہاں کیوں آئے؛ چلے جاؤ......خدا کے لئے چلے جاؤ"۔

"میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا حمیداں۔"

"نہیں.....نہیں.....میں تو مر چکی ہوں اختر"۔

تب رام پیاری کی آواز آئی "اب چلی آؤ حمیداں۔ دیکھو تو وہ تمہاری طرف آ رہا ہے"۔

"چھپ جاؤ۔ چھپ جاؤ۔ میں رات کو رام پیاری کو بھیجوں گی۔ اس کٹے ہوئے کھیت میں"۔

اس نے تیز تیز کہا اور اٹھ کر گاؤں کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں پھر رینگ کر کھیت کے درمیان میں لوٹ آیا۔ میں نہیں جانتا کب شام پڑی لیکن آہستہ آہستہ کٹے ہوئے کھیت کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ دھان کا ڈھیر اندھیرے میں دھندلا

سا نظر آ رہا تھا۔ دیر بعد گاؤں کی طرف ایک سایہ لپکا۔ وہ دھان کے ڈھیر کے پاس آکر رک گیا۔

سائے نے پکارا "ویرا! تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں پیارو!"

"ویرا میری بات مان اور یہیں سے لوٹ جا۔"

"پیارو! میں تمہیں اور حمیداں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"ہمیں لے جا کر کیا کرو گے۔ اگر ہو سکے تو گاؤں کو آگ لگا جاؤ۔ ہماری لاشیں یہیں چتا پر ڈال جاؤ۔"

"نہیں ...... جاؤ..... حمیداں کو یہاں لے آؤ۔"

"وہ نہیں آئے گی۔ میں اس کی طرف سے تمہیں یہی کہنے آئی تھی۔"

"پھر میں تمہارے ساتھ گاؤں میں چلوں گا۔"

"گاؤں میں؟" رام پیاری کی آواز ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا سر میرے سینے سے آلگا۔

میرے دائیں کندھے میں درد کی ٹیس اٹھی ہے۔ میں تکیے پر سر رکھ کر کچھ دیر آرام کروں گا۔ شاید اب مجھے آج اور لکھنے کی اجازت نہ ملے۔

۲۸ر نومبر ۶۵

میں نے کہا "میں تمہیں ساتھ لئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ دیکھو اب دیر نہ کرو۔"

اس نے میرے ارادے کے سامنے سر جھکا دیا۔ وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔ گاؤں کی گلیاں ویران تھیں۔ کوئی کتا بھی نہیں بھونک رہا تھا۔ پیارو مجھے ان گلیوں میں سے گزار کرلے گئی جن میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے مجھے ایک ڈیوڑھی میں کھڑا کر دیا۔ اس نے کہا۔ "یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں"
وہ چند منٹوں میں واپس آگئی۔ اس نے کہا "آؤ ویرا! تیری بہنیں تیرے استقبال کے لئے ایک کمرے میں اکٹھی ہیں۔"

صحن میں اندھیرا تھا۔ وہ دبے پاؤں چل رہی تھی۔ اس نے سانس روکا ہوا تھا۔ میں سانس روکے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے میرے کان کے قریب منہ لاکر سرگوشی کی "پہرے دار نشے میں گٹ ہے"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ تب دروازہ ذرا سا کھلا ایک جھری میں سے روشنی کی ایک کرن نکلی اور میں نے پہرے دار کو دیکھ لیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ اس کا سر ڈھلک گیا تھا اور ٹھوڑی سینے پر آگئی تھی۔ رائفل دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ معاً دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے جھپٹ کر رائفل کو ہاتھ میں لیا۔ کندے کی ایک ضرب سے وہ ڈھیر ہو گیا۔ رام پیاری نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لڑکیاں دور کر کونوں میں جا چھپی ہیں۔ دھندلی روشنی میں میں کسی کو نہ پہچان سکا۔

میں نے پوچھا "پیارو! ان میں حمیدہ کون ہے"

"حمیداں ان میں نہیں ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

رام پیاری نے منہ پھیر لیا۔ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "پیارو! بتاؤ حمیداں کہاں ہے؟"

اس نے سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کا دروازہ اس بڑے کمرے میں کھلتا تھا اور اب بند تھا۔ میں آگے بڑھا تو رام پیاری نے مجھے روک لیا۔ اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور میرے کان میں آہستہ سے کہا "ویرا! اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔۔۔۔۔ اس کے بعد اس مکان کو آگ لگا دینا۔"

میں نے جھری میں سے اندر جھانکا۔ کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی سرخ سرخ روشنی میں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جس کی پشت میری طرف تھی اور اس کے کندھوں پر لمبے لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انگیٹھی کی کارنس پر پڑی ہوئی بوتل میں سے کچھ چیز شیشے کے ایک گلاس میں انڈیل رہی تھی۔ گلاس بھر کر اس نے رخ پھیرا تو میں نے اسے پہچان لیا اور میں کانپ گیا۔ رام پیاری نے دروازے کے پٹ آہستہ سے بند کر دیئے اور کہا۔

"اب چلے جاؤ۔ ہم اب اس قابل نہیں رہیں کہ تیرا ساتھ دے سکیں۔"

"نہیں!"

میں نے لپک کر دروازہ کھول لیا۔ حمیداں کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا ہاتھ کانپا اور گلاس چھلک گیا۔ رام پیاری نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حمیداں کو خاموش

رہنے کا اشارہ کیا۔ حمیداں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی۔ دور کے کونے میں پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پر لیٹے ہوئے آدمی نے نیم باز آنکھوں سے حمیداں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کہنی کے بل ایک پہلو پر لیٹ کر گلاس ہاتھ میں لیا اور حلق میں انڈیل لیا۔ تب اس نے گلاس فرش پر پھینک دیا اور حمیداں کی کلائی ہاتھ میں پکڑ کر کہا "بس! ...... اب ہم نہیں بیٹھیں گے" وہ نشے میں دھت تھا۔ لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا اور حیران ہو کر کہا "یہ کون ہے؟" میں نے ایک جست لی اور کندا اس کے سر پر دے مارا۔ وہ پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں ایک خوف پتھرا گیا تھا۔ میں نے اس کے سرہانے پڑے پستول کو قبضے میں کر لیا۔ میں نے سیفٹی کو کھینچ لیا۔ میری انگلی لبلبی پر تھی اور نالی اس کی پیشانی پر کہ رام پیاری نے کہا "کیا کر رہے ہو ویر؟"

"میں اس کو........"

"نہیں.... ایسا نہ کرو۔ دشمن کو پتہ چل گیا تو...."

"تم ڈر گئی ہو پیارو؟"

"نہیں..... ویر!..... مجھے تیری جان کا خوف ہے۔"

میری انگلی لبلبی سے خود بخود اٹھ گئی۔

نرس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے یوں بھی میں تھک گیا ہوں۔

۲۹، نومبر ۶۵ء

وہ ڈری سہمی لڑکیاں میرے آگے آگے چل پڑیں۔ گاؤں سے نکل کر حمیداں نے کہا "اختر!... تم نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے اب مجھے

ساتھ لے جا کر کیا کرو گے ؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

رام پیاری نے کہا "پاگل نہ بنو حمیداں ..... چلو ....."

میں لڑکیوں کے قافلے کو لے کر نالے کے کنارے تک پہنچ گیا۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔

یکایک رام پیاری گھبرائی ہوئی آواز میں بول اٹھی "ویرا! حمیداں اندھیرے کی آڑ میں گم ہو گئی ہے"

"کیا کہا ؟"

"وہ پگلی بھاگ گئی ہے ..... پتہ نہیں کب سے"

"پیارو !"

"کہو ویر !"

میں نے پستول اس کے ہاتھ میں دے کر کہا "بہنیں بھائیوں کی عزت پر قربان ہو جاتی ہیں"

"ہاں ویر"

"حمیداں میری منگیتر ہے۔ وہ میری عزت ہے۔ تو بھی میری عزت ہے اور یہ ساری بہنیں میری عزت ہیں"

"ہاں ..... ہاں ..... کہو ..... میں سن رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں"

"میں انہیں حفاظت سے پہنچا کر واپس آؤں گا۔"

"ویرا! واپس نہ آنا ..... پرماتما کے لئے ..... دیکھ میں تیری بہن ہوں۔ یہ

میری خواہش ہے "

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اچھا تو پیارد ..... ایک گولی اس کے سینے کے پار کر دینا۔ دوسری گولی سے اس افسر کا سینہ چھلنی کر کے اپنے بھائی کی بے عزتی کا بدلہ لے لینا اور تیسری گولی ....."

"میں سمجھ گئی ہوں " رام پیاری نے کہا۔

قافلہ میرے آگے آگے تھا۔ جب ہم نالے کے اس کنارے پر چڑھ رہے تھے جہاں سلامتی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سنا ہٹ کی آواز سنی اور پھر میں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کھو گیا۔

اف! دائیں کندھے کے نیچے پھر سخت ٹیس اٹھی ہے۔ قلم میرے ہاتھ .....

ڈائری پڑھ چکنے کے بعد میں نے ایک آہ بھر کر پوچھا "حوالدار صاحب! یہاں کہانی ختم ہے؟"

"جی ..... اختر کو کندھے سے نیچے گولی لگی تھی اور اس کا دائیاں پھیپھڑا زخمی ہو گیا تھا۔ وہ بھلا چنگا ہو کر پھر اچانک بیمار ہوا۔ جب نرس پہنچی تو ڈائری اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی قلم گر گیا تھا اور موت کا پیالہ پی چکا تھا۔ میں یونٹ کی طرف سے ہسپتال میں بھیجا گیا۔ میں نے اس کی لاش اس گاؤں میں جا کر دفن کروائی جہاں اس کے ماں باپ پناہ گزین تھے۔ میں نے ان سے اجازت لے کر یہ ڈائری اپنے قبضے میں کر لی "

"میں حیران ہوں حوالدار صاحب! حمیداں رستے میں گم کیوں ہوگئی"۔

"وہ غیرت مند لڑکی تھی"۔

"لیکن دوسری لڑکیاں بھی تو....."

"ٹھیک ہے پر وہ اُن میں سے کسی کا منگیتر نہیں تھا۔ یوں بھی اس نے ان میں سے کسی کی بے شرمی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی تھی"۔

"رام پیاری نے اپنا فرض ضرور پورا کیا ہوگا۔ میں بھی پاگل ہوں۔ اب آپ کو کیا پتہ؟"

"جی! رام پیاری واپس نہ آئی اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس نے اس افسر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ان لوگوں کی زبانی جو دشمن کی قید میں رہے۔ انہیں خود اس سنی سنائی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن رام پیاری واپس نہ آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ضرور اپنا فرض ادا کر دیا تھا"۔

"یقیناً..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں حوالدار صاحب! لیکن آپ کہانی کا یہ حصہ تو چھوڑ گئے ہیں کہ سپاہی اختر علی کے کہنے کے مطابق اس کی منہ بولی بہن نے پہلی گولی حمیداں کے سینے میں اتار دی"۔

میرے اس سوال پر حوالدار صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ان کے ہونٹ کانپنے۔ وہ چند لمحوں تک گُم سُم رہے۔ پھر انہوں نے کہا "آپ حمیداں سے مل چکے ہیں"۔

"ہیں! .... حمید اس سے..... نہیں تو ....!" میں نے حیران ہو کر کہا.
ان کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے.
اور دوسرے لمحے میں سمجھ گیا.
"جی ہاں! میں اس بدقسمت سے مل چکا ہوں. کاش میں اسے خط کا جواب لاکر دے سکتا."
میری آواز آنسوؤں سے تر تھی.
آنسوؤں کی دھند میں میں نے سپاہی اختر علی اختر کو دیکھا. وہ اپنے خون میں نہایا ہوا مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "وہ اس پگلی سے کہہ دیجئے! میں نے تو اسے کب کا معاف کر دیا ہے. پر ہمیں اس دنیا سے اس دنیا کو خط لکھنے کی اجازت نہیں."

(۱۰ / دسمبر ۱۹۶۸ء)

(افسانے کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں)